اسلام
اور عصرِ جدید

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵

اسلام اور عصرِ جدید

مدیر

اقتدار محمد خاں

نائب مدیر

محمد سعید انور

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

(جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر)

جلد نمبر: ۵۵ اکتوبر ۲۰۲۳ء شمارہ: ۴

ISSN 2278-2109

اعانت زر کی شرحیں

	فی شمارہ	سالانہ	
اندرون ملک	100/روپے	380/روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش	4/امریکی ڈالر	15/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	12/امریکی ڈالر	40/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے)

حیاتی رکنیت

اندرون ملک	5000/روپے
پاکستان و بنگلہ دیش	150/امریکی ڈالر
دیگر ممالک	400/امریکی ڈالر

اس شمارے کی قیمت 100/روپے

پرنٹنگ اسسٹنٹ: راشد احمد **ٹائٹل:** ارتج گرافکس

© جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ
مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

پتہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

Website: www.jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع وناشر: **پروفیسر اقتدار محمد خاں** اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

بانی مدیر

ڈاکٹر سید عابد حسین (مرحوم)

مجلسِ ادارت

پروفیسر اقبال حسین (صدر)

- پروفیسر طلعت احمد
- نجیب جنگ آئی۔اے۔ایس (ریٹائرڈ)
- سید شاہد مہدی آئی اے ایس (ریٹائرڈ)
- لیفٹیننٹ جنرل محمد احمد ذکی (ریٹائرڈ)
- پروفیسر اختر الواسع
- پروفیسر محمود الحق
- پروفیسر سلیمان صدیقی

فہرست

- حرف آغاز — اقتدار محمد خاں — ۷
- خواتین کی اعلیٰ دینی تعلیم عصر حاضر کے تناظر میں — شائستہ پروین — ۱۳
- اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے حقوق — محمد احمد نعیمی — ۱۹
- عہد ممالیک کے مصر میں علم وثقافت — انیس الرحمٰن قاسمی — ۴۳

- اسلام کے اہم سیاسی افکار: عالمی تناظر میں — محمد اسامہ — ۷۳
- اسلام میں حقوقِ اطفال — ندیم سحر عنبرین — ۹۹
- ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز: ایک تعارف — محمد صلاح الدین ایوبی — ۱۱۱
- تعارف وتبصرہ — محمد سعید انور — ۱۳۷

حرف آغاز

ام المومنین سیدہ جویریہ کا پیدائشی نام برّہ تھا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیل فرما کر جویریہ رکھا۔ سلسلہ نسب حسبِ ذیل ہے: برّہ بنت حارث بن ابی ضرار بن حبیب بن عائذ بن مالک بن جذیمہ بن سعد بن عمرو بن ربیعہ بن حارثہ بن عمرو مزیقیاء۔

سیدہ کی پیدائش آپ صلی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت سے تقریباً دو سال قبل ہوئی۔ آپ کا تعلق قبیلہ بنو مصطلق سے ہے۔ قبیلہ بنی خزاعہ کی ایک شاخ کا نام بنو مصطلق تھا، جو خزیمہ ابن سعد ابن عمر کی اولاد سے ہے۔ خزیمہ کا لقب 'مصطلق' تھا۔ یہ بہت خوش آواز تھا۔ سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا کے والد حارث بن ابی ضرار اسلام لانے سے پہلے زمانے کے مشہور رہزن اور ڈاکو تھے۔ ان کو مسلمانوں سے خاصی عداوت تھی۔ اپنے قبیلے کے سردار مانے جاتے تھے اس لیے بنو مصطلق کا پورا قبیلہ رہزنی

وڈکیتی میں آپ کا ساتھ دیتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ام المومنین سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے پہلے یہ قبیلہ مسلمانوں کے خلاف تقریباً ہر جنگ کا حصہ رہا لیکن جب سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا ام المومنین بنیں تو اس قبیلے کے اکثر لوگوں نے اسلام قبول کرلیا اور رہزنی وڈکیتی چھوڑ کر مہذب زندگی اختیار کرلی تھی اور اس کے بعد مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آنے سے پہلے سیدہ کا نکاح صفوان بن ابی الشفر کے بیٹے مسافع کے ساتھ ہوا تھا۔ انہی دنوں سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا کو ایک عجیب خواب آیا۔ آپ دیکھتی ہیں کہ یثرب یعنی مدینہ منورہ سے چاند چلتا ہوا ان کی گود میں اترتا ہے۔ خواب چونکہ بہت عجیب وغریب تھا اس وجہ سے آپ اسی وقت بیدار ہوئیں اور اس کی تعبیر سوچنے لگیں۔ لیکن اس خواب کا کسی سے حتی کہ اپنے شوہر مسافع سے بھی ذکر نہیں کیا۔ کچھ دنوں بعد جب آپ کا نکاح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا تو آپ نے اپنے خواب کی تعبیر پالی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں غزوہ بنومصطلق ایک نہایت اہم واقعہ کے طور پر رونما ہوا ہے۔ اس سفر میں حضرت عائشہؓ پر افک کا بہتان باندھا گیا تھا۔ بحمد للہ اس غزوے میں آپؐ کو فتح وکامرانی نصیب ہوئی۔ فتح کی خوشیاں لے کر لوٹ ہی رہے تھے کہ منافقین نے ان خوشیوں کو غم میں بدل دیا اور واقعۂ افک پیش آ گیا۔ کچھ وقفہ بعد قرآن کریم نے واقعہ افک کے ذمہ داروں کو جھوٹا قرار دیا اور سیدہ عائشہؓ کی عفت

و پاکدامنی پر مہر لگائی جس سے ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا۔ اسی جنگ کا ایک اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ اس میں بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی سیدہ جویریہؓ (برّہ بنت حارث قبل از اسلام) بھی جنگی قیدی بن کر حاضر ہوئیں۔ سیدہ کے والد سردار تھے اور اپنے قبیلے کے علاوہ اطراف کے قبیلوں میں بھی ان کی عزت وشہرت تھی۔ سیدہ کی بہتر تربیت ہوئی تھی۔ وہ آداب مجلس اور فن گفتگو میں ماہر تھیں مگر قبیلے کی شکست اور اپنی گرفتاری کے باعث ذرا نڈھال تھیں۔ انھیں صرف اسی بات سے تسلی ملتی تھی کہ فاتحین روایتی قسم کے قبائل سے بہت مختلف تھے۔ انھیں ان کا اخلاق وکردار قابل رشک اور ان کے سردار کی سیرت نہایت پرکشش نظر آئی تھی۔ کسی بھی معزز سردار کی بیٹی کے لیے غلامی قبول کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ مال غنیمت اور غلام و باندیاں تقسیم ہوئیں تو سیدہ جویریہ مشہور صحابی حضرت ثابت بن قیسؓ کے حصے میں آئیں۔ حضرت ثابتؓ ایک بلند مرتبہ صحابی رسولؐ تھے اور آنحضور کے مقرر کردہ خطیب بھی۔ دیگر قبائل کے خطباء کا آپ موقر جواب دیتے تھے۔ آپ کی آواز میں گرج اور الفاظ میں جادو بیانی تھی۔ اس کے باوجود انھیں احساس تھا کہ ان کے حصے میں آنے والی لونڈی شریف زادی ہے اور وہ خود فقر وفاقہ میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ سیدہ نے حضرت ثابتؓ سے درخواست کی کہ وہ ان سے قیمت وصول کر لیں اور انھیں آزاد کر دیں۔ حضرت ثابت راضی ہو گئے اور قیمت طے ہو گئی۔ ظاہر ہے اس وقت ادائیگی کے لیے سیدہ کے پاس کچھ نہ تھا لیکن انھیں علم تھا کہ اللہ کے رسول کسی بھی سوالی کو نامراد نہیں لوٹاتے ہیں۔ کافی

پس وپیش کے بعد ہمت کر کے حضور کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا:

مصیبت کی ماری اور بدحال عورت ہوں، آزادی حاصل کرنا چاہتی ہوں اور مالك سے مکاتبت بھی ہوگئی ہے۔ مکاتبت کی رقم کی ادائیگی میں آپ میری مدد فرمائیں۔

بڑے مہذب انداز میں دست سوال دراز کیا۔ آپؐ کو معلوم تھا کہ سیدہ نجیب الطرفین خاتون ہیں۔ ساتھ ہی آپؐ چاہتے تھے کہ قبیلہ بنومصطلق میں دعوت کے کام کی راہ ہموار ہو چنانچہ آپؐ نے فرمایا:

اگر تم پسند کرو تو میں مکاتبت کی رقم ادا کردوں اور تم سے نکاح کرلوں۔

سیدہ کے لیے اس پیش کش سے بہتر کیا بات ہوسکتی تھی۔ سیدہ نے سعادت سمجھ کر رضا مندی کا اظہار کیا۔ یوں انھیں آزادی بھی ملی اور ام المومنین کا شرف بھی حاصل ہوگیا۔ سیدہؓ کے حرم نبوی میں داخل ہوتے ہی تمام انصار ومہاجرین نے بلا توقف اعلان کردیا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرالی رشتہ داروں کو قید اور غلامی میں کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ایک خاتون کی برکت سے قبیلے کے تمام اسیران کو آزادی مل گئی۔ اس واقعہ سے حضرت جویریہؓ کی قدر ومنزلت پورے قبیلۂ مصطلق میں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی اور ساتھ ہی انصار ومہاجرین کے نزدیک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ومرتبہ بھی سبھی اہل عرب کو معلوم ہوگیا۔

ایک بڑا سردار ہونے کے ناطے جویریہؓ کے والد کو اپنی بیٹی کی گرفتاری اور غلامی پر بڑی پریشانی اور عار محسوس ہوئی۔ چنانچہ وہ کافی مال واسباب لے کر مدینہ آئے تا کہ اپنی بیٹی کی رہائی کا سامان کر سکے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا:

آپ جانتے ھیں کہ میں ایك سردار ھوں اور اپنی بیٹی کی غلامی مجھے گوارا نھیں ھے۔ آپ جتنا چاھیں مال لے لیں اور میری بیٹی کو آزاد کردیں۔

آپؐ نے حسبِ عادت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا اور پھر فرمایا:

ٹھیك ھے تم اچھے مقصد سے آئے ھو مگر وہ دو اونٹ جو تم نے وادی عقیق میں چھپا دیے ھیں، ایسا کیوں کیا؟

حارث کو حیرت ہوئی، اس نے تعجب سے پوچھا: آپ کو کیسے معلوم ھوا؟ آپ نے فرمایا: مجھے میرے رب نے بتایا ھے۔

حارث آپؐ کی عسکری قوت اور اخلاقی برتری کا تو پہلے سے قائل تھا، اب اس کو یقین بھی ہو گیا کہ یہ اللہ کے سچے رسول ہیں اور اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

آپ اپنی بیٹی سے معلوم کرلیں وہ جو کھے اس پر عمل ھوگا۔ اسی دوران انہیں معلوم ہوا کہ ان کی بیٹی اب لونڈی نہیں بلکہ آپؐ کی زوجہ مطہرہ ہیں تو ان کی خوشی دوبالا

ہوگئی۔ اس طرح قبیلہ بنومصطلق پورا کا پورا حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔

سیدہ جویریہؓ نے ایک بار آپؐ سے عرض کیا: یا رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دیگر ازواج فخر کرتی ہیں۔ آپ نے دریافت کیا کس بات پر؟ سیدہ نے عرض کیا: زیادہ حقِ مہر پر۔ آپؐ نے فرمایا: کیا میں نے آپ کے مہر میں بڑی رقم ادا نہیں کی؟ کیا مہر میں آپ کی قوم کے چالیس غلام آزاد نہیں کیے گئے؟ یہ سن کر سیدہ کو اطمینان ہوا۔

سیدہ جویریہؓ نہایت عبادت گزار، تقویٰ وللّٰہیت والی، پیکر صبر و رضا اور جود وسخا میں ممتاز تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عمدہ اوصاف عطا فرمائے تھے۔ ۶۵ سال کی عمر میں آپ کی وفات ۵۰ ہجری ماہ ربیع الاول میں ہوئی۔ مدینہ منورہ کے حاکم مروان بن حکم نے نماز جنازہ پڑھائی اور آپ کو جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

اقتدار محمد خاں

شائستہ پروین*

خواتین کی اعلیٰ دینی تعلیم عصر حاضر کے تناظر میں

مسلمانوں کی علمی، فکری اور دینی ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہم ذریعہ مدارس دینیہ ہیں جن کا کوئی دوسرا متبادل نہیں ہے۔ ہماری تاریخ کا کوئی دور مدارس دینیہ کے وجود سے خالی نہیں رہا۔ مسلم معاشرے کے قیام سے لے کر آج تک ان کا فعال وجود قائم ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے مسجد نبوی کی بنیاد رکھنے کے ساتھ ہی دینی تعلیم کا باقاعدہ اہتمام فرمادیا تھا اور مسجد نبوی کے چبوترے کو علم دین کے حصول کے لیے خاص کردیا تھا، چنانچہ یہاں اصحاب کی تعداد تین چار سو تک پہنچ جاتی تھی۔ قرآنی آیات کو یاد کرنا اور احادیث مبارکہ کی حفاظت کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا یہ تاریخ انسانی کا پہلا رہائشی مدرسہ تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اسے دنیا کی پہلی ریزیڈینشیل یونیورسٹی قرار دیا۔ آپ کے دست اقدس کے ذریعہ قائم ہونے والا صفہ کا پہلا مدرسہ دنیا بھر میں مدارس کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ ماضی میں بڑے پیمانے پر سیاسی تبدیلیوں کے باوجود مدارس کا قیام اور ان میں درس وتدریس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ ان کا ثمرہ تھا کہ سلطنتیں بنتی بگڑتی رہیں اور دینی مدارس سے علماء ومشائخ، مفکرین ومحققین اور ادباء وشعراء بڑی تعداد میں تیار ہوکر خدمت میں لگے رہے اور ہر محاذ پر دینی افکار اور مذہبی تعلیمات کے محافظ بن کر ڈٹے

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ دینیات (سنی) ویمنس کالج، اے ایم یو، علی گڑھ ای میل: drshaistaparveen17@yahoo.in

رہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کی تہذیبی اقدار اور مسلم معاشرے کی تاریخی روایات کو بحفاظت اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کا اہتمام بھی کرتے رہے۔

ہر ادارہ کسی نہ کسی مقصد کے تابع ہوتا ہے، نیز اس ادارے میں رائج نظام اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وضع کیا جاتا ہے۔ تمام ادارے اسی اصول کے تحت مصروفِ عمل ہیں۔ میڈیکل کالجز ڈاکٹر تیار کرنے کے لیے ہیں، انجینئرنگ کے ادارے انجینئر تیار کرتے ہیں، لاء کالجز وکلاء تیار کرنے میں مصروف عمل ہیں، عسکری ادارے جنگی صلاحیتوں سے آراستہ جوان تیار کرتے ہیں، غرض یہ کہ پوری دنیا اسی انداز میں نظر آئے گی یہاں تک کہ مدارس دینیہ بھی اسی اصول پر قائم ہیں۔ ذیل میں مدارس کے اصول ومقاصد ذکر کیے جاتے ہیں:

۱۔ ملک میں ایسے علمائے دین تیار کرنا جو قرآن وسنت سے متعلق ضروری علم کے حامل ہوں اور جن کے ذریعہ عام مسلمانوں کو شریعت کے معاملہ میں رہنمائی میسر آسکے۔

۲۔ افتاء وقضا کے منصب پر فائز ہوکر احسن طریقے سے اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے والے اشخاص تیار کرنا۔

۳۔ تصنیف وتالیف اور تحقیق کے میدان میں کام کرنے والے مصنف ومحقق تیار کرنا تاکہ دینی تعلیمات کو بحفاظت اگلی نسلوں تک منتقل کیا جاسکے جس طرح ہم سے پہلے علماء نے اپنی تصنیفات اور تحقیقات کے ذریعہ دین کو ہم تک پہنچایا ہے۔

۴۔ دینی عقائد کے خلاف سر اٹھانے والے فتنوں کا مقابلہ کرنا اور ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے ماہرین تیار کرنا۔

۵۔ دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے مضامین کی تدریس کے لیے لائق وفائق اساتذہ تیار کرنا، نیز اسکول، کالجز اور جامعات میں دینی وشرعی مضامین پڑھانے کے لیے اساتذہ فراہم کرنا۔

۶۔ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ مثلاً یہود وہنود اور نصاریٰ وغیرہ کو دین حق کی دعوت دینے اور ان کے شکوک وشبہات کو رفع کرنے کے لیے مبلغین

اسلام تیار کرنا۔

ان کے علاوہ اور بھی ذیلی مقاصد ہیں جو کسی بھی انسانی معاشرہ کی دینی، شرعی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے پیش آتے رہتے ہیں۔

انسانی معاشرہ مرد وخواتین پر مشتمل ہے اور اس میں انسانیت کی بہترین تعمیر وترقی کی معمار اول 'عورت' ہے جو بہن، بیٹی، بیوی کے مدارج کو طے کرتی ہوئی اپنے نقطۂ عروج 'ماں' کے مقدس مقام اور عظیم مرتبہ تک پہنچتی ہے اور جس کے آغوش سے اسلام کے بنیادی افکار اور صالح کردار کے حامل افراد وجود میں آتے ہیں۔عورت کے اس مقام کے مدنظر اسلام نے مرد وعورت دونوں کے لیے تحصیل علم کو ضروری قرار دیا ہے اس لیے اگر افراد امت کے مابین تعلیم وتربیت کا صحیح بندوبست نہیں کیا جاتا ہے تو گویا ان کی بنیادی معاشرتی ضرورت سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً بیس کروڑ بتائی جاتی ہے، جبکہ یہاں کی نصف آبادی خواتین پر مشتمل ہے، ان میں صرف ایک فیصد خواتین تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ ایک افسوسناک پہلو ہے کہ ہندوستان کی ایک فیصد مسلم تعلیم یافتہ خواتین میں سے بھی اکثریت ایسی خواتین کی ہے جو صرف عصری علوم وفنون سے واقفیت رکھتی ہیں اور وہ خواتین جو دینی تعلیم کے حصول میں کوشاں ہیں ان کی تعداد انگلیوں پر شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ ہندوستان کے اہم مدارس کی ایک سروے رپورٹ کے مطابق، جو کہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کی جانب سے کیا گیا ہے اور اتر پردیش، اڑیسہ، بہار، بنگال، پنجاب، چنڈی گڑھ، راجستھان، کرناٹک، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور ہریانہ کے مدارس پر مشتمل ہے، اس میں پایا گیا ہے کہ طلباء کی کثیر مدارس کے مقابلے ہندوستان میں طالبات کے ۲۲/ مدارس ہیں جبکہ یہاں خواتین کی آبادی نصف بتائی جاتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان چند مدارس نسواں کے ذریعہ ایک متوازن معاشرے کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ اور کیا انسانیت کی تعمیر وترقی اور اسلامی معاشرے کی تشکیل ان قلیل مدارس کے ذریعہ ممکن ہے؟ جبکہ تہذیب وتمدن کی بقاء وارتقاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن میں اعلان کرتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاَةَ وَيُؤْتُونَ

الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ أُوْلَـئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّهُ إِنَّ اللّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ. (سورہ توبہ:۷۱)

اور مومن مرد و عورت آپس میں ایک دوسرے کے مددگار و معاون اور دوست ہیں۔ وہ بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں، نمازوں کو پابندی سے بجالاتے ہیں، زکوۃ ادا کرتے ہیں، اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات مانتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ بہت جلد رحم فرمائے گا۔ بے شک اللہ غلبہ والا، حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے معاشرے کو برائیوں سے محفوظ رکھنے اور نیکی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے ہر مومن اور مومنہ کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے جس میں مرد اور عورت کا کوئی استثناء نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں پوری انسانیت کی تعمیر و ترقی اور فلاح و کامیابی مقصود ہے نہ کہ کسی فرد واحد کی۔ اسی لیے معاشرتی نظم و نسق اور سماج کو تباہ و برباد کرنے والے عناصر سے محفوظ رکھنے میں عورت بھی مرد کی طرح برابر کی حصہ دار ہے اور اس کے بغیر کسی معاشرے کے ارتقاء کا صحیح معنوں میں تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ تمدن کا ارتقاء دونوں کے باہمی اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل ایسے صالح افراد کے ذریعہ ہی وجود میں آسکتی ہے جو اسلام کے بنیادی افکار کے حامل ہوں، معروفات و منکرات سے واقفیت رکھتے ہوں، انھیں شرک و بدعت کے سنگین نتائج کا احساس ہو اور اسلامی نظام زندگی کا پوری طرح علم ہو۔ ان اوصاف سے متصف اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین ہی معاشرے کی اصلاح کا کام انجام دے سکتی ہیں۔

انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے:

When you teach a boy you teach a person and when you teach a girl you teach a generation.

اگر آپ ایک لڑکے کو تعلیم دیں گے تو ایک فرد کو تعلیم دیں گے۔ اگر ایک لڑکی کو تعلیم دیں گے تو ایک نسل کو تعلیم دیں گے۔

نسلیں چونکہ ماں کی گود میں پروان چڑھتی ہیں اس لیے اگر مائیں ہی علوم و فنون سے بے بہرہ اور ناآشنا ہوں تو وہ اپنی اولاد کی تربیت اور نشو و نما صحیح خطوط پر کیسے کرسکیں گی؟ اسی لیے تاریخ ساز شخصیتیں علم دوست خواتین کی گودوں میں پروان چڑھتی ہیں۔ اسلامی تاریخ بنانے اور اسلام کی نشر و اشاعت میں

جو کردار تعلیم یافتہ خواتین نے ادا کیا ہے وہ اسلامی سپاہیوں کے تیر وتلوار نے بھی نہیں کیا ہے۔

اسلام کے عائلی نظام کو آج جس نظر سے دیکھا جا رہا ہے اس کا علم کم وبیش ہر پڑھے لکھے شخص کو ہوگا۔ اس نظام کا بنیادی ستون نکاح اور دوسرا مرد کے لیے حق طلاق اور عورت کے لیے حق خلع کے ضوابط پر مشتمل ہے۔ چند اہم اخلاقی اور تمدنی مقاصد اور بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر اسلام نے ازدواجی قوانین بتائے ہیں۔ انھیں مقاصد کی خاطر تعدد ازدواج اور پردے کے احکام دوسری طرف وراثت اور وصیت کے قوانین وضع کیے ہیں۔ ان سارے قوانین کے اندر انسانی فطرت کے تمام تقاضوں اور ایک صالح تمدن کی تمام مصلحتوں کو نہایت حکیمانہ انداز میں سمو دیا گیا ہے جس سے سماجی بگاڑ اور عائلی انتشار کو اس طرح محفوظ کر دیا گیا ہے کہ کوئی بھی حق پسند اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا، مگر افسوس موجودہ ہندوستان میں اسلام پر اغیار کے چوطرفہ حملوں نے مسلمانوں کا سکون واطمینان سلب کر لیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مسلم خواتین سے متعلق مسائل مثلاً عورتوں کی امامت، سیاست، پردہ، طلاق، تعدد ازدواج پر اعتراضات کی بوچھار کر دی ہے اور مسلم معاشرے میں غلط فہمیاں پیدا کر کے انھیں کو اسلام کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ حالات کی تبدیلی کے لیے شعور کو پیدا کیا جائے۔ اگر آج مسلم خواتین میں دین وشریعت کا صحیح فہم ہوتا تو حالات دگرگوں نہیں ہوتے، مگر افسوس کہ ہمارے مفکرین نے اس پہلو پر توجہ نہیں دی اور شہر شہر، قریہ قریہ مدارس نسواں قائم نہیں کیے۔ جہاں مسلم بچیوں کو اسلامی عقائد، عبادات، دینی مبادیات، اسلامی نظام ازدواج، اصول معاشیات وغیرہ باتوں کا صحیح علم وفہم دیا جاتا اور اغیار کی کوششیں ناکام ہو جاتیں۔ لہٰذا حالات کی تبدیلی کے لیے ملت کے سنجیدہ افراد کو خواتین کی اعلیٰ دینی تعلیم کی طرف توجہ دینی ہوگی۔ ہر انقلاب سے پہلے فکری تربیت، ذہن سازی اور علمی استعداد کا مرحلہ ضرور آتا ہے جس کے لیے علم ایک ضروری عامل ہے جو کہ مدارسِ نسواں اور اس میں قرآن وحدیث اور علوم اسلامیہ کے تحقیقی علم سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اہلِ اسلام کا فرض ہے کہ دین کو زندہ رکھنے کے لیے، دین پر ہونے والے حملوں کو روکنے کے لیے، دینی مدارس کے قیام وانتظام اور طریقۂ تعلیم وتربیت پر پوری توجہ دیں۔ اس کے لیے چند امور کی طرف توجہ ضروری ہے:

۱۔ دین کی اصل حفاظت انھیں علماء کے ذریعہ سے ہو رہی ہے جو دین کی بعینہٖ تعلیم دے رہے ہیں۔ اگر یہ معلمین نہ ہوں تو دین وشریعت کے محفوظ رہنے کی کوئی

ضمانت ہمیں میسر نہیں آسکتی۔ دنیا میں کہیں کا بھی بگڑا ہوا معلم کے ہاتھوں سدھر سکتا ہے مگر معلم کے ہاتھوں جو بگڑ جائے اس کی اصلاح کسی کے ہاتھ نہیں ہوسکتی۔ ساتھ ہی طلباء میں مذہبی فکر بیدار کرنا، ان میں صلاحیت کے جوہر پیدا کرنا، اخلاق و کردار کو سنوارنا اور احساسِ ذمہ داری پیدا کرنا اور پیش آمدہ مسائل کو معقولیت کے ساتھ حل کرنے کا ہنر معلم کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لیے بہتر سے بہتر اساتذہ کا انتخاب کرنا چاہیے۔

۲۔ آج صحافت کی دنیا پر الحاد و بے دینی کا قبضہ ہے، عوام کی ذہن سازی اور دین مخالف تحریریں و بیانات کی مرعوبیت کو ختم کرنے کے لیے تحریری صلاحیت پیدا کرنا اہم ضرورت ہے۔

۳۔ دینی جامعات میں یونیورسٹی کی طرح ریسرچ اور بحث و تدقیق کا شعبہ قائم ہونا چاہیے جس میں عہد حاضر کے مسائل اور دیگر موضوعات پر کتابیں لکھی جائیں، خواتین کو دوران تعلیم دوسرے اعلیٰ تعلیمی اداوں اور تحقیقی منصوبوں سے نہ صرف واقف کرایا جائے بلکہ ان کا دورہ بھی کرایا جائے۔ یہ ایک افسوسناک پہلو ہے کہ آج تک دینی جامعات سے فارغ طالبات میں سے کسی نے بھی لائق ذکر تحقیقی کام انجام نہیں دیئے ہیں۔

۴۔ دینی تعلیم سے ہٹ کر جو خواتین معاشرے میں سرگرم عمل ہوں، خواہ علمی خدمت انجام دے رہی ہوں یا پھر سماجی خدمت گزار ہوں، ہندو ہوں، مسلمان ہوں یا عیسائی ہوں، انہیں جامعات میں بلانے اور ان سے اخذ و استفادہ کا موقع ملتے رہنا چاہیے تاکہ ان میں اعتماد کے ساتھ ساتھ وسعت ذہن اور سماجی خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہو۔

آج کے مدارسِ نسواں کچھ اہم اور نتائج خیز تبدیلیوں کے منتظر ہیں، طالبات کے ساتھ دین و شریعت کا مستقبل ان مدارس پر موقوف ہے۔ اگر ذمہ داران کی یہی غفلت رہی تو کچھ بعید نہیں کہ ان کا وجود ہی ختم ہو جائے۔

محمد احمد نعیمی *

اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے حقوق

کفر وشرک اسلامی شریعت اور اس کے دستور میں سب سے بڑا گناہ ہے اور اس کے مرتکب دورِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے لیکن اس گناہ کے مرتکبین کو بھی اسلام نے انسانی ومعاشرتی حقوق سے محروم نہیں رکھا ہے۔ ان کے لیے بھی بنا کسی فرق وامتیاز کے ان حقوق کی خاص رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یہاں تک کہ غریبوں، مسکینوں اور مفلسوں کی مالی اعانت، پریشاں حالوں ومجبوروں کی مدد کے سلسلے میں مسلم وغیر مسلم کی کوئی قید نہیں رکھی ہے بلکہ سب کے ساتھ یکساں حسن سلوک سے پیش آنے کی نصیحت کی گئی ہے اور انسانیت کے ناطے تمام ضرورت مندوں کی حاجت روائی کا حکم دیا گیا ہے۔

ابتدائے اسلام میں بعض مومنوں کو شبہ ہوتا تھا کہ کافر ومشرک اعزاء واقرباء کے ساتھ کیسے محبت وہمدردی اور صلہ رحمی کا برتاؤ کیا جائے۔ چنانچہ قرآنِ پاک اور حدیث پاک نے اسی دور میں اس مسئلہ کو بالکل واضح فرمادیا اور ارشاد فرمایا :

لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی ای میل: 9253naeemi@gmail.com

يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ. إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ.[1]

اللہ تمھیں ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل وانصاف سے منع نہیں کرتا جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہ کی ہو اور تمھیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا ہو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ اللہ تمھیں ان لوگوں سے دوستی کو منع فرماتا ہے جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ مین جنگ کی ہو اور تمھیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمھیں نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی، جو ان سے دوستی کرے وہی ظالم ہیں)

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے :

عن اسماء بنت أبی بکر رضی اللّٰہ عنھما قالت ائتنی امی راغبة فی عھد النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ، فسالت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اَصِلُھَاقَالَ نعم.[2]

حضرت اسماء بنت ابوبکر فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں میری والدہ (جو مشرک تھیں) عمدہ سلوک کی طلب میں میرے پاس (مدینہ) تشریف لائیں۔ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا میں اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں ان کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

قرآن وحدیث کی عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ جو قوم مسلمانوں سے جنگ وجدال نہ کرے اور ان کو ان کے گھروں سے نہ نکالے تو ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کو اسلام منع نہیں کرتا۔ بعض لوگ لاعلمی یا تعصب کی بنا پر کہتے ہیں کہ اسلام میں اقلیتوں یعنی غیر مسلموں کے حقوق محفوظ نہیں ہیں، ان کے ساتھ تفریق کی جاتی ہے۔ مظلوم ومجبور ہونے کی صورت میں ان کے ساتھ انصاف کا

برتاؤ نہیں کیا جاتا ہے۔ یہ سراسر بہتان والزام ہے کیونکہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ جس میں غیر مسلموں کے حقوق مالی وجانی اعتبار سے مسلمانوں کے حقوق کے مساوی ہیں۔ اسلامی حکومت میں غیر مسلم اسلامی دستور کے مطابق اپنے جملہ تمدنی حقوق سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اپنے پرسنل لاء پر عمل کر سکتے ہیں، اپنے معاملات کے فیصلے خود کر سکتے ہیں، اپنی عبادت گاہیں تعمیر کر سکتے ہیں، ان کے مال و جائیداد پر کوئی جبراً قبضہ نہیں کر سکتا۔ ان کی جان وعزت نفس پر کوئی دست درازی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

من قتل نفسًا معا هِداً لم يرح رائحة الجنّةِ وانّ ريحها يوجد من مسيرة اربعين عامًا. [۳]

جس نے کسی ایسے غیر مسلم کو قتل کیا جس سے معاہدہ ہو چکا ہو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی دوری سے محسوس ہوگی۔

الا من ظلم معاهدًا او انتقصهُ او كلفه فوق طاقة و اخذ شيئًا بغير طيب نفس فانا مجيحه يوم القيامة. [۴]

خبردار! جس شخص نے کسی غیر مسلم معاہد پر ظلم کیا یا اس کی عیب جوئی کی یا اس کی طاقت سے بڑھ کر اس سے کام لیا اور اس کی کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر لے لی تو میں قیامت کے دن اس کے خلاف رہوں گا۔

اموالهم كاموالنا ودمائهم كدمائنا واعراضهم كاعراضنا. [۵]

ان کے مال ہمارے مالوں کی طرح ہیں اور ان کے خون ہمارے خونوں کی طرح ہیں اور ان کی عزت ہماری عزتوں کی طرح ہے۔

مذکورہ بالا جملہ احادیث معاہد یا ذمی افراد کے بارے میں ہیں اور معاہد یا ذمی سے مراد وہ غیر مسلم لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کے شہری ہوں یا جن سے اسلامی سلطنت کا معاہدۂ امن وصلح ہو یا جو اسلامی ریاست میں جزیہ (ٹیکس) دے کر رہتے ہوں۔ ایسے کسی غیر مسلم کو ناحق قتل کرنا کھلی بدعہدی ہے اور جو مسلمان یہ حرکت کرے گا وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔ یہی نہیں بلکہ حدیثِ

رسول کا تیور و مزاج اس بات کو بھی سخت ممنوع قرار دیتا ہے کہ اسلامی حکومت میں کسی غیر مسلم پر ظلم کیا جائے، اس کی عیب جوئی کی جائے، اس سے زیادہ محنت لی جائے یا اس کا مال غصب کیا جائے۔ جو لوگ ایسی حرکت و گناہ کے مرتکب ہوں گے حدیث شریف کے مطابق وہ بروز قیامت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت و ناراضگی کے حقدار ہوں گے۔

مختصر یہ کہ اسلام نے غیر مسلموں یا اقلیتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کے انسانی حقوق متعین کرنے میں کوئی جانب داری یا حق تلفی سے ہرگز کام نہیں لیا ہے بلکہ ان کے مال، خون اور عزت کو مسلمانوں ہی کی طرح محترم قرار دیا ہے اور مسلمانوں کی طرح ان کو بھی مذہبی، سماجی و معاشی اور نجی معاملات میں مساوات کا حق دیا ہے۔

اقلیتوں کے سیاسی و شہری حقوق ہوں یا عدل و انصاف کے حقوق، مذہب و عقیدے کی آزادی کا مسئلہ ہو یا مذہبی عبادت گاہوں کے تحفظ اور مذہب کی تبلیغ کا مسئلہ، عزت و آبرو اور جان کی حفاظت کا معاملہ ہو یا زمین و جائیداد و مال کی حفاظت کا معاملہ، تعلیم کا حق ہو یا محنت و اجرت کا حق اور رہائشی آزادی کا حق ہو یا مذہبی آزادی کا حق، اسلام نے ہر میدان میں ان کو آزادی و برابری کا حق دیا ہے بلکہ معاہد یا ذمی غیر مسلم کے حقوق کے بارے میں مسلمانوں کو بار بار متوجہ کیا ہے اور عہد و پیمان کی پاسداری کا مکمل لحاظ رکھنے کی تاکید کی ہے۔ اسی لیے اسلامی شریعت میں ان کو معاہد یا ذمی کا نام دیا گیا ہے۔ لسان العرب میں ہے:

> **ومن ذالک یسمّی اھل العھد اھل الذمة وھم الذین یؤدون الجزیة من المشرکین کلھم، ورجل ذمی معناہ رجل لہ عھدة.**[۶]
> اور اسی وجہ سے اہل ذمہ کو اہل عہد (معاہد) کہا جاتا ہے، یہ وہ مشرکین ہیں جو جزیہ ادا کرتے ہیں اور رجل ذمی سے مراد ایسا شخص ہے جس کے لیے عہد کیا گیا ہو۔

علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں:

> **وسمی اھل الذمة لدخولھم فی عھد المسلمین وامانھم.**[۷]
> اہل ذمہ کو ذمی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے عہد اور امان میں

داخل ہیں۔

جزیہ وخراج کے مسئلے میں بظاہر مسلم وغیر مسلم کے مابین فرق نظر آتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ غیر مسلموں کے ساتھ ناانصافی ہے جو مذہبی اختلاف کی وجہ سے ان کے ساتھ کی گئی ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ جزیہ یا خراج وغیرہ کا غیر مسلموں پر عائد ہونا مذہبی اختلاف کی وجہ سے نہیں بلکہ ذمہ داریوں وضرورتوں کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض ہے جو ایک اسلامی رکن وعبادت ہے، ظاہر ہے کہ یہ عبادت غیر مسلم پر واجب نہیں کی جاسکتی اس لیے ان پر معمولی و ادنیٰ سا ٹیکس جزیہ کہ صورت میں عائد کیا جاتا ہے۔ اور یہ اصول وقانون دنیا کی ہر قوم و ہر ملک میں پایا جاتا ہے۔ کہیں اس کو جزیہ کہا جاتا ہے، کہیں ٹیکس، کہیں کر اور کہیں خراج وغیرہ۔

اسلامی ریاست میں اقلیتوں یعنی غیر مسلموں پر جو جزیہ نافذ ہوتا ہے دراصل وہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری کی اجرت ہے اور اسلامی حکومت کی یہ امتیازی شان ہی ہے کہ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے وہ ذمیوں کی حفاظت سے معذور رہی ہے تو ان سے لیا ہوا جزیہ واپس کر دیا ہے۔ اس طرح اگر غیر مسلموں نے فوجی خدمات انجام دی ہیں تو جزیہ معاف کر دیا گیا ہے۔[۸]

دنیا کا ہر دانش مند اچھی طرح جانتا ہے کہ قوم و ملک کے تحفظ وسلامتی پر کتنے غیر معمولی اخراجات ہوتے ہیں۔ لیکن اتنے شدید اخراجات کے باوجود اسلام نے اقلیتوں کی جانی، مالی، نفسی، مذہبی، انفرادی اور سماجی تحفظ کے بدلے ایک ادنیٰ سا ٹیکس جزیہ کی شکل میں عائد کیا ہے اور اس کے عوض مسلمانوں سے زیادہ ان کو مراعات عطا کی ہیں۔ مثلاً اسلامی حکومت پر دشمن کے حملہ کرنے کی صورت میں مسلمان پر جہاد فرض ہے جس میں ان کو جان و مال دونوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس کے برخلاف اقلیتوں پر جہاد فرض نہیں اور ان کو جانی و مالی کوئی قربانی نہیں دینی ہوتی ہے۔ مسلمانوں پر ہر سال زکوٰۃ فرض اور عشر واجب ہوتا ہے۔ لیکن غیر مسلم اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ یہ اسلامی عبادات ہیں ان پر صرف معمولی سا جزیہ (ٹیکس) واجب ہوتا ہے۔

خیال رہے کہ اسلام نے ظلم وستم اور فتنہ وفساد دفع کرنے اور جان و مال اور عزت وآبرو کے تحفظ کے لیے جنگ و جہاد کو مسلمانوں پر ضروری قرار دیا ہے لیکن اس سلسلے میں مسلمانوں کو مکمل آزاد نہیں چھوڑا ہے کہ وہ جو چاہیں کریں بلکہ میدانِ جنگ میں بھی ان کو اخلاقی ہدایات کا پابند بنایا ہے اور دشمن و

حریف کے ساتھ حتی الامکان حسن سلوک سے پیش آنے کا درس دیا ہے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

انطلقوا بسم اللّٰہ وبا للّٰہ علی ملّۃ رسول اللّٰہ لا تقتلوا شیخًا فانیًا ولا طفلًا صغیرًا ولا امرأۃ ولا تغلوا وضمّوا غنائمکم واصلحوا واحسنوا فان اللّٰہ یحب المحسنین.[9]

دشمنوں سے جہاد کے لیے اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کی تائید کے ساتھ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ملّت پر قائم رہتے ہوئے نکل کھڑے ہو! (لیکن خیال رہے کہ) ناتواں، بوڑھوں، چھوٹے بچوں اور عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ، مالِ غنیمت میں خیانت نہ کرو۔ جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے سب ایک جگہ جمع کرو اور احسان کا طریقہ اختیار کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

اسی طرح صحیحین میں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

وجدت امرأۃ مقتولۃ فی بعض مغازی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فنھیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن قتل النساء والصبیان.[10]

غزواتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی میں ایک عورت مقتول پائی گئی تو آپؐ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔

دنیا کی اکثر اقوام کا جنگ کے حوالہ سے اگر ہم مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بنام جنگ سب کچھ جائز تھا، کوئی اخلاق وانسانی اصول وظابطہ نہیں تھا۔ وہ اپنے مقابل وحریف کے نہ صرف بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ظلم وستم کرتے تھے بلکہ ان کے باغات اور کھیت کھلیان وغیرہ کو بھی تباہ برباد کردیا کرتے تھے جیسے ویدوں میں مذکور آریوں اور اناریوں کی معرکہ آرائیاں یا مہابھارت کے کورو پانڈوں کی جنگ یا عیسائی اقوام کی بربریت وسفاکی وغیرہ۔ اس کے برخلاف اسلام نے نہ صرف بچوں، بوڑھوں اور عورتوں پر دست درازی سے منع فرمایا بلکہ جانوروں اور پیڑ پودوں پر بھی ظلم

کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ چنانچہ ترمذی شریف میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب شام کی جانب لشکر بھیجا تو یزید بن ابی سفیان کو دس باتوں کی وصیّت کرتے ہوئے فرمایا:

والیٰ موصیک بعشر لاتقتلنّ امرأۃً ولا صبیّا ولا کبیرًا هرمًا ولا تقطعنّ شجرًا مثمرا ولا تخربنّ عامرًا ولا تعقرن شاۃ ولا بعیرًا الا لما کلۃ ولا تحرقن نخلاً ولا تغرقنّه ولا تغلل ولا تجبن.[11]

میں تجھ کو دس باتوں کی وصیت کرتا ہوں، عورت کو مت مارنا اور نہ بچوں کو اور نہ بوڑھوں کو اور کانٹے دار اور پھل دار درخت کو ہرگز مت کاٹنا اور نہ کسی بستی کو اجاڑنا اور نہ کسی بکری اور اونٹ کی کونچیں کاٹنا، مگر کھانے کے واسطے اور نہ جلانا کھجور کے درخت کو اور مت ڈبونا اس کو اور غنیمت کے مال میں چوری نہ کرنا اور بزدلی کا مظاہرہ نہ کرنا۔

معلوم ہوا کہ اہل قتال جن سے جنگ و جہاد کرنا اور ان پر ہتھیار اٹھانا جائز ہے اسلامی نقطۂ نظر سے ان پر بھی غیر محدود حق حاصل نہیں ہے بلکہ اس کی بھی حدود اور کچھ اخلاقی قوانین ہیں جن کی پابندی انتہائی ضروری ہے۔

اسلام سے قبل اہل عرب کا طریقہ تھا کہ رات میں بے خبر سوتے لوگوں پر قتل و غارت گری کرتے۔ اسلام نے اس ظالمانہ حرکت کی اصلاح فرمائی اور صبح سے قبل کسی پر حملہ کرنے سے منع فرمایا۔ اس دور میں عام طور پر دشمن کو زندہ جلا دینے کا معمول تھا۔ اسلام نے اس وحشیانہ عمل کو بھی سخت ممنوع قرار دیا۔ اسی طرح دشمن کو باندھ کر تڑپا تڑپا کر مارنے کا بھی رواج عام تھا، اسلام نے اس کی بھی سختی کے ساتھ مذمت کی۔ لوگ جنگ کے علاوہ بھی لوٹ مار کیا کرتے تھے، اسلام نے جنگ کے علاوہ اس کو سخت حرام قرار دیا اور دشمن کے مال و چوپایوں پر دست درازی کرنے سے بہت سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ اسی طرح حکم دیا کہ دشمن فوج کے کسی بھی شخص کے جسمانی اعضاء نہ کاٹے جائیں نہ بگاڑے جائیں اور دشمن قوم کے راہبوں اور عابدوں کو نہ ستایا جائے اور نہ ان کی عبادت گاہیں مسمار کی جائیں۔[12]

نبویؐ معاشرے میں اقلیتوں کے حقوق کی کتنی رعایت اور تحفظ کیا گیا ہے اور غیر مسلموں کے

ساتھ کس قدر حسن اخلاق کا مظاہر کرنے اور وسعت قلبی سے پیش آنے کا درس دیا ہے اس کو فتح مکہ کے تاریخی حقائق کی روشنی میں بھی بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ کفار مکہ نے مسلسل کئی سالوں تک پیغمبر اسلام اور آپ کے ماننے والوں پر جسمانی، مالی، ذہنی، قلبی اور سماجی ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے اور ہر آسائش وآرام سے محروم کرنے کی ناپاک کوشش کی، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا کیا اور پیغمبر اسلام نے اپنے ہزاروں ماننے والوں کے ساتھ مکہ کو فتح کیا تو آپ نے ان سارے دشمنوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ معاف فرمادیا کہ جنہوں نے ایک عرصۂ دراز تک طرح طرح کے ظلم وتشدد کا آپ اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو شکار بنایا تھا۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت سعد بن عبادہ نے ابوسفیان سے کہا "**الیوم یوم الملحمة**" آج لڑائی کا دن ہے، آج انتقام کا دن ہے، آج ماضی کے ظلم وستم کا بدلہ لیا جائے گا۔ یہ سن کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اتنا ناراض ہوئے کہ ان سے جھنڈا لے کر ان کے بیٹے قیس کے سپرد فرمادیا اور ابوسفیان سے فرمایا: "**الیوم یوم المرحمة**" آج انتقام کا نہیں بلکہ آج رحمت اور معاف کرنے کا دن ہے۔[۱۳]

اسلامی شریعت کی رو سے اگر کوئی غیر مسلم دشمن کے خوف، یا کسی مصیبت و پریشانی کے وقت اگر کسی مسلمان سے پناہ مانگتا ہے تو اسلام نے اس کو پناہ دینے کی بھی پوری اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُون. [۱۴]

اور اگر مشرکوں کافروں میں سے کوئی اگر تمہاری پناہ کا طلب گار ہو تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ اس کو اللہ کا کلام سننے کا موقع مل جائے، پھر تم اس کو اطمینان کی جگہ پر پہنچادو۔ یہ اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔

اسلام نے صرف غیر مسلم کو پناہ دینے کا حکم نہیں دیا بلکہ اگر کوئی غیر مسلم کسی دشمن کو پناہ دے تو اس کو بھی مسلمان کی پناہ کے مثل قرار دیا ہے۔ حدیث شریف میں مرقوم ہے:

عن أبی هریره قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: من دخل دار أبی سفیان فهو امن ومن القی السلاح فهو آمِن

ومن اغلق بَا بَهُ فهو آمِن. [۱۵]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (فتح مکہ کے موقع پر) فرمایا: جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا اس کو امان ملے گی، جو ہتھیار ڈال دے گا اس کو بھی امان ملے گی اور جو اپنا دروازہ بند کرلے گا اس کو بھی امان ملے گی۔

مذکورہ بالا فرمان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر جاری فرمایا تھا۔ اس وقت ابوسفیان قریش کا سردار، کافروں کے لشکر کا کمانڈر اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت جانی دشمن تھا لیکن آپ نے نہ صرف اس کو معاف کر دیا بلکہ جو ان کے گھر میں داخل ہوگیا اس کو بھی معافی نامہ عنایت فرما دیا۔ اسی طرح مکہ میں آپ کے اور مسلمانوں کے جو دوسرے دشمن تھے ان کو بھی معاف کر دیا گیا اور ارشاد فرمایا گیا:

لا تثريب عليكم اليوم اذهبوا انتم الطلقاء [۱۶] آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

غزوۂ خیبر کے موقع پر بھی آپ نے بے مثال محبت و رحم دلی کا مظاہرہ کیا اور ارشاد فرمایا:

انَّ اللّٰه تعالیٰ لم يحل لكم ان تدخلوا بيوت اهل الكتاب اِلَّا بِاِذْنٍ وَلاَ ضرب نَسآء هم ولا اكل ثمارهم اذا اعطوكم الذى عليهم. [۱۷]

اور بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ بات جائز نہیں رکھی ہے کہ تم بلا اجازت اہل کتاب کے گھروں میں داخل ہو جاؤ، نہ ان کی خواتین کو مارنے کی اجازت ہے اور نہ ان کے پھل کھانے کی جب تک کہ وہ اپنی ذمہ داری ادا کرتے رہیں۔

اسی طرح اسلام نے غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کا مظاہرہ کرنے اور ان کے کھانے پینے اور آرام کا مکمل خیال رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِيناً وَيَتِيماً وَأَسِيراً. إِنَّمَا

نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيْدُ مِنكُمْ جَزَاء وَلَا شُكُوراً . [۱۸]

اور باوجودیکہ ان کو خود طعام کی خواہش (اور حاجت) ہے فقیروں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کہ ہم تم کو خالص اللہ کے لیے کھلاتے ہیں نہ تم سے عوض کے خواستگار ہیں نہ شکرگزاری کے (طلبگار)

اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

الا سیر من اهل الشرک یکون فی ایدیهم. [۱۹] اسیر وہ ہے جس کا تعلق اہل شرک سے ہے جو مسلمانوں کے قبضے میں قیدی ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

لقد اسرا للّٰه با لا سر یٰ ان یحسن الیهم و ان اسرا هم یومئذ لا هل الشرک. [۲۰]

اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوکا حکم دیا ہے اور اس دور میں ان کے قیدی اہل شرک (غیر مسلم) ہوتے تھے۔

قرآن مجید کے علاوہ کتب احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ غیر مسلم قیدیوں کو کھانا کھلانا انتہائی مستحسن عمل ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہ نے غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ انتہائی عمدہ برتاؤ کیا ہے۔ چنانچہ جب جنگ بدر میں مشرکین کے ۷۰ افراد قتل ہوئے اور ۷۰ ہی قیدی بنائے گئے تو ان قیدیوں کو اللہ کے رسولؐ نے صحابہ کرام کے درمیان تقسیم فرما دیا اور حکم دیا کہ ان کیساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ یہاں تک کہ جنگ بدر کے قیدیوں کو جب رسیوں میں جکڑا گیا تو ان کی تکلیف و پریشانی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دیکھی نہ گئی، جس کی وجہ سے آپ پریشان ہو گئے اور کافی رات تک سو نہیں پائے، لہٰذا صحابہ کرام نے ان کی رسیوں کے بندھن کھول دیئے اور پھر آپ نے آرام فرمایا۔ [۲۱] حضرت مصعب بن عمیر کے بھائی ابوعزیر بن عمیر کہتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں نضر بن حارث کے بعد مشرکین کا میں علمبردار تھا۔ میں بھی قید ہوا اور بعض انصار کے سپرد کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کا انصار پر یہ اثر تھا کہ صبح و شام کھانے کے وقت مجھے روٹی کھلاتے اور خود کھجور پر گزارہ کرتے۔ ان میں سے کسی کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ملتا تو مجھے دے دیتا اس کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا، اس سے

مجھے شرمندگی سی محسوس ہوتی تھی۔[۲۲]

خیال رہے کہ اسلام نے صرف جنگ ومعرکہ آرائی اور قیدی ہونے کی صورت میں ہی اقلیتوں وغیر مسلموں کے تئیں حسن سلوک کا مظاہرہ نہیں کیا ہے بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں عمدہ برتاؤ کا درس دیا ہے اور انسانی حقوق کے نفاذ میں ان کے ساتھ مکمل عدل وانصاف سے کام لیا ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں جس فراخ دلی اور عظیم رواداری کا نمونہ پیش کیا ہے وہ پوری دنیا کے لیے قابل عمل ہے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فتح حیرہ کے موقع پر جو معاہدہ ہوا تھا اس میں تحریر تھا:

ایّما شیخ ضعف عن العمل او اصا بته اٰفة من الاٰ فات او کانَ غنیًّا فا فتقر وصا راهل دینه یتصد قون علیه طرحت جزیته وعیل من بیت مال المسلمین وعیا له ما اقام بدا رِ الهجرة ودار الاسلام. [۲۳]

کوئی بوڑھا جو کام سے معذور ہو جائے یا کوئی سخت مرض میں مبتلا ہو کر مجبور ہو جائے یا جو مالدار ہو پھر اس طرح ہو جائے کہ خیرات کھانے لگے ایسے لوگوں سے جزیہ نہیں لیا جائے گا اور جب تک وہ زندہ رہیں ان کے اہل و عیال کے اخراجات مسلمانوں کے بیت المال سے پورے کئے جائیں گے۔ جب تک ان کا قیام دار الہجرات اور دار الاسلام میں رہے گا۔

کسی مسلمان کے معذور یا مجبور ہو جانے پر شریعت اسلامی بیت المال سے اس کی کفالت و تربیت کا حکم دیتا ہے اور یہی حکم ذمی غیر مسلم کے لیے ہے۔ چنانچہ حضرت سعید بن المسیب سے مروی ہے:

''ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم تصدق صدقه علی اهل بیت من الیهود فهی تجری علیهم.'' [۲۴]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے ایک گھرانے کو صدقہ دیا اور حضور کے وصال کے بعد بھی وہ انہیں دیا جا رہا ہے۔

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے:

''تصدقو اعلیٰ اهل الادیان'' تمام اہل مذاہب پر صدقہ وخیرات

کرو۔[۲۵]

اس طرح اسلام نے محتاجوں ومعذوروں کی خدمت کے لیے زندگی کے تمام شعبوں میں حسن سلوک کا درس دیا ہے اور مسلم یا غیر مسلم، قومی یا غیر قومی، نسلی یا غیر نسلی اور ملکی یا غیر ملکی کا فرق کئے بغیر سب کے ساتھ یکساں سلوک کیے جانے کا حکم دیا ہے۔ فرمان رسول علیہ السلام ہے:

الخلق کلهم عیال اللّٰه فا حبّهم الَی اللّٰه انفعهم لعیاله.[۲۶]

ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور خدا کی نظر میں سب سے محبوب وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ اچھا برا ؤ کرے۔

عدل وانصاف اور حق گوئی بھی اسلامی تعلیمات کا ایک روشن باب ہے۔ عدل کے اسلامی معنی ہیں باہمی معاملات میں عدل وانصاف سے کام لینا۔ اسلام نے عدل وانصاف کے آئین وقوانین دوست دشمن، مسلم وغیر مسلم، اپنے بیگانے سب کے لیے یکساں مقرر فرمائے ہیں اور کسی بھی صورت میں کسی کی رعایت کر کے ناانصافی وظلم کا باب نہیں کھولا ہے۔ چنانچہ اللہ رب العزت اپنے مقدس کلام قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُم شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی.[۲۷]

کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان سے عدل و انصاف نہ کرو، ہر حال میں عدل کرو یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُوْنُوْا قَوَّامِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا.[۲۸]

اے ایمان والو انصاف پر خوب قائم ہو جاؤ اللہ کے لیے گواہی دیتے ہوئے چاہے اس میں تمہارا نقصان ہو یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا جس پر گواہی دو وہ غنی ہو یا فقیر ہو اللہ کو اس کا سب سے زیادہ اختیار ہے تو خواہش کے پیچھے نہ جاؤ کہ حق سے الگ پڑ جاؤ اور اگر تم ہیر پھیر یا روگردانی کرو تو اللہ کو

تمہارے کاموں کی خبر ہے۔

إِنَّ اللّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤدُّواْ الأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُواْ بِالْعَدْلِ إِنَّ اللّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ إِنَّ اللّهَ كَانَ سَمِيْعاً بَصِيْراً. [۲۹]

بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں جن کی ہیں ان کے سپرد کرو اور یہ کہ جب تم لوگوں میں فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ بے شک اللہ تمہیں کیا ہی خوب نصیحت فرماتا ہے۔ بلاشبہ وہ سب کچھ سننے و دیکھنے والا ہے۔

حق گوئی وانصاف کی نصیحت کرتے ہوئے مزید فرمایا گیا:

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُواْ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَى وَبِعَهْدِ اللّهِ أَوْفُواْ. [۳۰]

اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو اگر چہ تمہارے رشتہ دار کا معاملہ ہو اور اللہ کا عہد پورا کرو۔

فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُواْ عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ. [۳۱]

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُواْ بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ. [۳۲]

اور اگر تم سزا دو تو ایسی ہی سزا جیسی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی تھی۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عدل وانصاف کے معاملہ میں سب کے ساتھ یکساں طور پر کس قدر مساوات اور ایک جیسا سلوک کرنے کے داعی و ہادی تھے اس کا اندازہ آپ اس حدیث پاک سے بخوبی لگا سکتے ہیں جو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

قریش ایک مخزومی عورت کے سلسلے میں فکرمند ہوئے جس نے چوری کی تھی کہنے لگے اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کون سفارش کرے؟ سب نے کہا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ہیں، ان کے سوا کون ایسے کام کی جرأت کر سکتا ہے؟

چنانچہ حضرت اسامہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی تو آپ نے فرمایا:

اِنَّمَا اَهلَکَ الَّذِینَ مِن قَبلِکم اَنَّهم کَانو اِذَا سرق فِیهِم

الضَّعِیف اقامو ا علیه الحدَّو ایم اللّٰه ان فاطمة بنت محمَّدٍ سَرَقَت لَقَطَعت یَدَهَا. [۳۳]

تم سے پہلے لوگ اسی لیے ہلاک ہوئے کہ جب ان کا کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ اللہ کی قسم اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی چوری کرتیں تو میں ان کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔

اس طرح قرآن واحادیث کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے عدل وانصاف میں مساوات وحق کوئی واجب وفرض ہے۔

باہمی معاملات میں عدل وانصاف سے کام نہ لینا بسا اوقات ہلاکت وخونریزی، عداوت و بغاوت، نقض امن وفساد کا موجوب اور سراسر ظلم وستم ہوتا ہے اس لیے اسلام بنا تفریق مذہب وملت یا مسلم اور غیر مسلم عدل وانصاف کے معاملات میں ہی ظلم کا سد باب نہیں کرتا بلکہ کسی بھی شعبے یا معاملے میں وہ اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرے یا اس کے رنج وخوف کا باعث بنے اور اس کو تکلیف ونقصان پہنچائے۔ علاوہ ازیں کہ وہ کس قوم یا کس مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ اس لیے اسلام نے اس کو سد باب وروک تھام کے لیے بڑے سخت وروشن قدم اٹھائے ہیں اور کہیں کوئی ایسا موقع فراہم نہیں کیا ہے جس سے انسان فریب کھا کر ظلم وستم کے بھیانک وتاریک گڑھے میں اوندھے منہ گر سکے۔ چنانچہ ظلم وظالم کی مذمت کرتے ہوئے اللہ رب العالمین ارشاد فرماتا ہے:

وَالظّٰلِمِیْنَ مَالَهم مِّن وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیر. [۳۴] (اور ظلم کرنے والوں کا کوئی حمایتی ومددگار نہیں)

لَا تَظلِمونَ وَلَا تظلَمونَ. [۳۵] (نہ تم کسی کو نقصان پہنچاؤ اور نہ تمہیں نقصان ہو)

وَاِنَّ الظّٰلِمِینَ لَهم عَذَاب اَلِیم. [۳۶] (بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے)

اس طرح قرآن نے ظلم کو بہت ہی عظیم گناہ قرار دیا ہے اور اس سے باز رہنے کی بڑی سخت

ہدایت ونصیحت فرمائی ہے۔اور صرف ظلم سے اجتناب واحتراز کی تاکید نہیں فرمائی ہے بلکہ اگر کسی نے آپ پر ظلم کیا ہے تو اس کے جواب میں ظالم ومجرم کے ساتھ انتقامی طور پر بھی انصاف سے تجاوز کرنے کو ناپسند کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ ایسی صورت میں بھی اسی حد تک انتقام ضروری ہے کہ جتنا ظلم آپ کے ساتھ کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں قرآن مقدس نے جو روشن تعلیمات وہدایات مرحمت فرمائی ہیں وہ اس طرح ہیں :

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْ اعَلَیهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰ ی عَلَیکُمْ. [۳۷]

جوتم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اسی کے برابر زیادتی کرو جو اس نے تم پر کی ہے۔

وَإِنْ عَـاقَبْتُمْ فَعَاقِبُواْ بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ. [۳۸] (اور اگر تم سزا دو تو ایسی ہی سزا جیسی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی تھی)

قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ رب العالمین کسی حال وکسی صورت میں ظلم کو پسند نہیں فرماتا۔،مقام غور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ خالق ومالک اور حاکم ہونے کے باوجود کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا تو پھر انسان اور اس کی مخلوق ومحکوم کے لیے یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وہ اسی کے عطا کردہ اختیارات اور طاقتوں کو دوسرے پر ظلم ڈھانے کے لیے استعمال کرے۔حدیث قدسی ہے:

عـن ابی ذرٍّ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فیما رَوَی عن اللّٰہ تبـارک و تـعـالـیٰ انـہ قـال: یـاعبـادی انّی حرّمت ظلمَ عَلیٰ نَفسِی وَجَعَلتَهُ بَینَکُمْ محرَّماً فلا تظالموا. [۳۹]

حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کرلیا ہے اور تمہارے درمیان بھی اس کو حرام ٹھہرایا ہے لہٰذا ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔

مختصر یہ کہ قرآن مجید وحدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ظلم وزیادتی سخت ناجائز و حرام ہے۔کسی پر ادنیٰ سے ادنیٰ ظلم کرنے کی بھی اسلام کسی حال میں اجازت نہیں دیتا بلکہ جو قصداً ظلم کرتا ہے یا ظالموں کی مدد کرتا ہے اسلام اس کو دائرہ اسلام سے خارج ہونے کی تنبیہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

من مشیٰ مع ظالم لیقویه وهو یعلم انَّهُ ظالم فقد خرجَ من الاسلام.

جو کسی ظالم کے ساتھ اس کو طاقت پہنچانے کے لیے چلا جب کہ جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے نکل گیا۔

اسلامی نقطہ نظر سے ہر انسان کی جان و مال اور اس کی عزت انمول نعمت الٰہی ہیں۔ مکمل آزادی کے ساتھ جن کی حفاظت کرنا ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ اسلامی اخلاق واقدار نے ہر انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ بے خوف زندہ رہے اور اس کی جان، مال وعزت ہر اعتبار سے محفوظ ہو۔ انہیں کسی قسم کا خوف اور نقصان لاحق نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

وَلَا تَقتلُوُاالنَّفسَ الَّتِی حَرَّمَ اللّٰه اِلَّا بِالحَق (اور کوئی جان جس کی حرمت اللہ نے رکھی ہے ناحق نہ مارو)

اسلامی اعتبار سے ایک انسان کی جان کی حرمت وعظمت کا یہ عالم ہے کہ ایک انسان کا ناحق خون تمام نسل انسانی کے خون کے برابر گناہِ عظیم اور ایک انسان کی جان کی حفاظت میں پوری انسانیت کی حفاظت کے برابر ثواب عظیم ہے۔ قرآن پاک ارشاد فرماتا ہے:

مَن قَتَلَ نَفسًا بِغَیرِ نَفسٍ اَوْ فَسَادٍ فِیُ الاَرضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیعًا. وَمَنْ اَحیَا هَا فَکَاَنَّمَا اَحیَا النَّاسَ جَمِیعًا. [۴۱]

جس نے کوئی جان قتل کی بغیر کسی جان کے بدلے یا زمین میں فساد کئے تو گویا اس نے سب لوگوں کا قتل کیا اور جس نے ایک جان کو بچایا اس نے گویا سب لوگوں کو بچایا۔

مذکورہ بالا آیات قرآنیہ میں جان کی حفاظت کے تعلق سے احکام صادر فرمائے گئے ہیں اور مال کی حفاظت کے سلسلے میں احکام الٰہی ہیں:

وَلَا تَاُکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالبَاطِل. [۴۲] (اور ایک دوسرے کا مال نا حق طریقے پر نہ کھاؤ)

یَا اَیّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَینَکُمْ بِا لبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنکُمْ. [۴۳]

اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ مگر یہ کہ
آپسی رضامندی سے لین دین کا معاملہ طے ہو۔

اس طرح اسلام نے مسلم ہو یا غیر مسلم ہر انسان کی جان و مال اور عزت کو محترم و معزز قرار دیا ہے اور اس کے تحفظ و دفاع کی انسان کو مکمل اجازت دی ہے۔

اس کے علاوہ اگر ہم سماجی و معاشرتی لحاظ سے اسلامی تعلیمات کا جائزہ لیں تو اس اعتبار سے بھی اسلام نے اقلیتوں اور غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی غیر جانب داری اور مساوات کا نمونہ پیش کیا ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ اسلام کفر و شرک کی سخت مخالفت کرتا ہے، توحید کی دعوت دیتا ہے لیکن دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اپنے عقائد بدلنے اور اسلام قبول کرنے کے لیے دباؤ نہیں ڈالتا۔ کسی بھی زور زبردستی سے اسلام کی دعوت دینے یا منوانے سے اسلام نے واضح طور پر منع فرمایا ہے اور حکمت و دانائی اور موعظہ حسنہ سے اسلام کی دعوت پیش کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ادْعُ إِلَى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ. [44] (اپنے رب کی طرف بلاؤ عمدہ تدبیر اور اچھی نصیحت سے اور ان سے اس طریقے سے پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو) اور "لاَ إِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ " [45] (دین کے معاملہ میں کوئی جبر و زبردستی نہیں) "فَمَن شَاء فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاء فَلْيَكْفُرْ ." [46] (جو چاہے ایمان قبول کرے اور جو چاہے کفر قبول کرے) " أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُواْ مُؤْمِنِيْن" [47] (کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ ایمان لائیں) جیسی قرآنی آیات کے ذریعہ ان کو مکمل آزادی کے ساتھ بنا کسی خوف و خطر کے زندگی گزارنے کا حق دیا ہے۔

مذکورہ بالا آیات سے بخوبی ظاہر ہے کہ اسلام نے اقلیتوں کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی مکمل آزادی عطا فرمائی ہے اور کسی ظلم و زیادتی سے واضح طور پر منع فرمایا ہے۔ چنانچہ الطبقات الکبریٰ اور زادالمعاد وغیرہ میں مذکور ہے کہ "ایک بار نجران کے عیسائیوں کا ۱۴/افراد پر مشتمل ایک وفد حضورؐ سے ملاقات کی غرض سے مدینہ منورہ آیا۔ آپؐ نے اس وفد کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور اس وفد میں شریک عیسائیوں کو مسجد نبوی میں ان کے طریقے پر نماز ادا کرنے سے منع نہیں فرمایا اور ان عیسائیوں نے مسجد نبوی کی ایک جانب مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ [48]

حضور انورؐ کے عہد میں حدود و تعزیرات اور دیوانی قوانین میں بھی مسلم اور غیر مسلم اقلیتی

لوگوں کا درجہ برابر تھا۔ دورِ رسالتؐ میں ایک بار ایک مسلمان نے ایک غیر مسلم کو قتل کر دیا۔ آپؐ نے قصاص کے طور پر اس مسلمان کے قتل کیے جانے کا حکم صادر فرمایا اور فرمایا:

''انا احق من اوفیٰ بذمته'' غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت میرا سب سے اہم فرض ہے۔[۴۹]

اسلامی حکومت میں حدود تعزیرات میں ذمی اور مسلمان کا درجہ برابر ہے۔ جرائم کی جو سزا مسلمان کو دی جائے گی وہی ذمی کو بھی دی جائے گی۔ ذمی کا مال مسلمان چرائے یا ذمی مسلمان کا ذمی چرائے دونوں صورتوں میں سزا ایک جیسی ہوگی۔ ذمی کو زبان یا ہاتھ پاؤں سے تکلیف پہونچانا، اس کو گالی دینا، مارنا، پیٹنا، یا اس کی غیبت کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مسلمان کے حق میں ناجائز ہے۔ چنانچہ فتاویٰ شامی میں ہے۔'' **ویجب کف الاذیٰ عنه وتحرم غیبة کا لمسلم**''غیر مسلم سے تکلیف واذیت کو روکنا اسی طرح واجب ہے جس طرح مسلمان سے اور اس کی غیبت کرنا بھی اسی طرح حرام ہے۔[۵۰]

ذریعہ معاش وروزگار بھی انسانی زندگی کا اہم جزو لاینفک ہے۔ اسلام نے حصول رزق و کاروبار کے سلسلے میں بھی اقلیتوں کو مکمل آزادی عطا فرمائی ہے جس طرح جو کاروبار مسلمان کر سکتے ہیں وہ غیر مسلم بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ حضور انورؐ نے اہلِ نجران کے لیے تحریر فرمایا کہ:''**وامان ان تذرو الربا واوتاذنوا بحرب من اللّٰه ورسوله**''(سود چھوڑ دو یا اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ)[۵۱]

کسی مسلمان کے معذور ویا مجبور ہو جانے پر شریعت اسلامی بیت المال سے اس کی کفالت و تربیت کا حکم دیتا ہے اور یہی حکم غیر مسلم ذمی کے لیے بھی ہے۔ چنانچہ حضرت سعید بن المسیب سے مروی ہے:

ان رسول اللّٰهِ تصدق صدقة علی اهل بیت من الیهود فهی تجری علیهم [۵۲]

رسول اللہؐ نے یہودیوں کے ایک گھرانہ کو صدقہ دیا اور حضور کے وصال کے بعد بھی وہ انھیں دیا جا رہا ہے۔

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے:

"تصدقو اعلیٰ اھل الادیان" تمام اہلِ مذاہب پر صدقہ وخیرات کرو۔[۵۳]

اس کے علاوہ اسلام نے غیر مسلموں کو مسلمانوں سے کاروبار کرنے کی بھی اجازت مرحمت فرمائی ہے چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ حضورؐ کی وفات اس حال میں ہوئی کہ آپ کی ذرہ ایک یہودی کے پاس ۳۰ صاع جو کے عوض رہن تھی۔[۵۴]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک مقام سے گزر ہوا تو آپ نے ایک بوڑھے نابینا یہودی کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے اس سے پوچھا تمہیں اس پر کس بات نے مجبور کیا؟ اس نے کہا کہ بوڑھا ضرورت مند ہوں اور جزیہ بھی دینا ہے۔ حضرت عمر نے اس کا ہاتھ پکڑا اور گھر لائے اور اس کو اپنے گھر سے کچھ دیا پھر اس کو بیت المال کے خازن کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ اس کا اور اس جیسے لوگوں کا خیال رکھو اور ان سے جزیہ لینا موقوف کرو کیونکہ یہ کوئی انصاف کی بات نہیں ہے کہ ہم نے ان کی جوانی میں ان سے جزیہ وصول کیا اور اب بڑھاپے میں ان کو رسوا کریں۔[۵۵]

انسانی معاشرے میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور ہر مذہب میں مختلف قسم کی محافل وثقافت کا اہتمام کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں اسلام نے وقت ضرورت ان کو دعوت دینے اور ان کی دعوت قبول کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وطعام الذین اوتو االکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم.[۵۶]

ان کا کھانا جن کو کتاب دی گئی تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔

خود رسول اللہؐ نے غیر مسلم یہودی کی دعوت قبول فرمائی ہے نیز غیر مسلموں کے کھانے کا اہتمام فرمایا ہے۔[۵۷]

کسی کی تعریف کرنا، شکریہ ادا کرنا یا دعا دینا بھی انسانی معاشرہ کا ایک اہم اخلاقی دستور ہے جس سے باہمی میل محبت کا ماحول پیدا ہوتا ہے، اسلام نے اس کو نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی روا رکھا ہے۔ حضورؐ کی ذات پاک چونکہ ہر قوم و طبقے کے لیے سراپا رحمت اور باعث برکت ہے،

یہی وجہ ہے کہ آپ نے غیر مسلموں کو بھی دعاؤں سے نوازا ہے۔ چنانچہ حضرت انس سے روایت ہے کہ رسو ل اللہؐ نے ایک غیر مسلم یہودی سے پینے کی کوئی چیز طلب کی، اس نے وہ خدمت میں پیش کی تو آپ نے اس کو دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حسین وخوبصورت رکھے۔ چنانچہ تاحیات اس کے بال سیاہ رہے۔ [۵۸]

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوۂ حسنہ اور حسنِ سلوک سے کفار کے بچوں کے ساتھ بھی محبت ونرمی کی تلقین فرمائی ہے۔ ایک یہودی شخص کا لڑکا آپ کی خدمت میں تھا، وہ ایک بار بیمار ہوگیا، آپ نے ازخود تشریف لاکر اس کی عیادت فرمائی، اس بچے کے سرہانے بیٹھے، پھر اس بچے سے فرمایا اسلام قبول کرو اس بچے نے اپنے والد پر نظر ڈالی، والد نے بھی کہا ابوالقاسم کی اطاعت کرلہٰذا وہ بچہ مسلمان ہوگیا۔ آپ کہتے ہوئے نکلے:

الحمد للّٰہ الذی انقذہ من النار (تمام تعریفیں اللہ کے لیے جس نے اس کو آگ سے بچالیا) [۵۹]

اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ بچے کے ساتھ شفقت ومحبت کی جائے چاہے وہ بچہ کافر کا ہی کیوں نہ ہو۔ نیز اس حدیث سے جہاں غیر مسلم بچوں کے ساتھ محبت وشفقت کا برتاؤ کرنے کا سبق ملتا ہے وہاں غیر مسلم کی عیادت کرنا بھی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ ردالمحتار علی الدر المختار میں ہے:

ولا باس بعیادۃ الیھودی والنصرانی لانہ نوع برّ فی حقھم وما نھینا عن ذالک. [۶۰]

یہودی اور نصرانی کی عیادت میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے کہ یہ ان کے حق میں ایک طرح کی بھلائی اور حسن سلوک ہے اس سے ہمیں منع نہیں کیا گیا ہے۔

اسی طرح اگر کسی غیر مسلم کا انتقال ہو جائے تو انسانیت کے ناطے اس کی تعزیت کے لیے جانے سے بھی اسلام منع نہیں کرتا۔ چنانچہ ردالمحتار علی الدر المختار میں ہے کہ ''کسی یہودی یا مجوسی کے بچے کا انتقال ہوجائے تو اس کے مسلمان پڑوسی کو اس کی تعزیت کرنی چاہئے اور کہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بہت اچھا جانشین عطا فرمائے اور آپ کے حالات کو بہتر بنائے۔ [۶۱]

انسانی زندگی اور انسانی معاشرہ میں پڑوس کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ ہر انسان اور ہر شئ کا کوئی

نہ کوئی یا کچھ نہ کچھ پڑوس ضرور ہوتا ہے مثلاً ایک انسان دوسرے انسان کا پڑوسی، ایک گھر دوسرے گھر کا پڑوسی، ایک خاندان دوسرے خاندان کا پڑوسی، ایک محلّہ دوسرے محلے کا پڑوسی، ایک شہر دوسرے شہر کا پڑوسی، اور ایک ملک دوسرے ملک کا پڑوسی ہوتا ہے۔ اسلام نے پڑوسیوں کو جو انسانی حقوق عطا فرمائے ہیں اور ان کے ساتھ جس حسنِ سلوک سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے وہ سب کے لیے عام ہے اس میں مسلم یا غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَبِذِيْ الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِيْ الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبِ. [۶۲]

اور ماں باپ سے بھلائی کرو اور ارشتہ داروں سے اور یتیموں اور محتاجوں اور پاس کے پڑوسی اور دور کے پڑوسی سے۔

اس طرح حدیث شریف میں ہے:

من كان يؤمن با للّٰه و اليوم الاخر فلا يؤذ جاره. [۶۳] (جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے پڑوسی کو اذیت نہیں پہونچانا چاہیئے۔

واللّٰه لايومن واللّٰه لا يومن واللّٰه لايومن قيل ومن يا رسول اللّٰه : قال الذى لا يامن جار بو ائقه". [۶۴]

اللہ کی قسم وہ ایمان والا نہیں عرض کیا گیا یا رسول اللہ کون؟ فرمایا جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانی سے بے خوف نہیں۔

من كان يؤمن با اللّٰه و اليوم الاخر فليكرم جاره. [۶۵]

جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔

عن ابى ذر قال: ان خليلى صل اللّٰه عليه وسلم اوصانى اذا طبخت مرقاً فاكثر مائة ثم انظر اهل بيتٍ من جير انِک فا صبهم منها بمعروف. [۶۶]

حضرت ابو ذر فرماتے ہیں کہ بے شک میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے

مجھے وصیت فرمائی ہے کہ جب تم سالن پکاؤ تو اس میں شوربہ زیادہ کرو اور
پھر اپنے پڑوسیوں کے گھر والوں کو دیکھو اور اچھی چیز ان کو بھی بھیجو۔

مذکورہ بالا فرمان خداوندی اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پڑوسی کے تعلق سے جو حسن اخلاق اور عمدہ برتاؤ کی ہدایت و نصیحت کی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے یکساں ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے انسانی زندگی اور انسانی سماج کے ہر شعبے اور ہر معاملے میں غیر مسلموں اقلیتوں کے حقوق کی مکمل پاسداری کی ہے اور دورِ رسالت میں تو اسکے مثالی نمونے صاف نظر آتے ہیں۔

حوالاجات

۱۔ سورۃ الممتحنہ، آیت:۹-۸
۲۔ صحیح بخاری ، کتاب الادب :۳۳/۴)
۳۔ بخاری شریف ، کتاب الدیات ، باب:۲۵، حدیث:۱۸۰۶
۴۔ سنن ابوداؤد ، کتاب الخراج و الفئی باب تعشیر اهل الذمه، حدیث:۶۹۱۴
۵۔ اسلام میں حقوق انسانی کا تصور، ص:۵۵
۶۔ لسان العرب، جلد۵، ص:۵۹
۷۔ النهایته فی غریب الحدیث و الا ثر، جلد۲، ص:۱۶۸
۸۔ الفاروق، ص:۱۳۵
۹۔ ابوداؤد شریف، جلد۱، ص:۳۵۱
۱۰۔ الجامع البخاری، باب قتل النساء فی الحرب، جلد۳، ص:۲۶۸
۱۱۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجهاد ، حدیث نمبر:۹۷۶، انسانی حقوق اور اسلامی نقطۂ نظر، ص:۳۴۴ تا ۳۴۶
۱۲۔ مسلم شریف، کتاب الجهاد، حدیث نمبر:۴۶۲۷
۱۳۔ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری جلد:۸، ص:۹، انسان العیون، جلد:۳، ص:۲۲، دار نشر الکتب الاسلامیہ، ۱۹۸۱ء
۱۴۔ سورۃ التوبہ، آیت:۶
۱۵۔ صحیح مسلم ، کتاب الجهاد ، باب فتح مکه، حدیث:۴۶۲۲
۱۶۔ جواهر الحدیث، ص:۲۲

۱۷۔ ابوداؤد، حدیث:۳۰۵۰، سیرت النبی ص:۱۱۹
۱۸۔ سورۃ الدہر، آیت:۹-۸
۱۹۔ قرطبی، **الجامع لاحکام القرآن**:۱۹/۱۲۹، **الحیئۃ المصریہ العامۃ**(۱۹۸۷ء)
۲۰۔ **الجامع الاحکام القرآن** :۱۹/۱۲۹
۲۱۔ ابن کثیر، **السیرۃ النبویہ**، جلد:۲ص:۴۵۶، ۴۶۳، **النکت و العیون**:۴/۳۷۰
۲۲۔ صحیح مسلم، ۴/۱۷۰۵، الحدیث۲۱۶۲
۲۳۔ انسانی حقوق اور اسلامی نقطۂ نظر، ص:۲۲۶
۲۴۔ **نصب الرایۃ**، جلد۲، ص:۳۹۸۔ عسقلانی، **الدرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ**، جلد:۱، ص:۲۶۶، دارالمعرفہ بیروت (لبنان)
۲۵۔ **نصب الرایہ الاحادیث الھدایہ** جلد:۲، ص:۳۹۸ (قاہرہ)
۲۶۔ مشکوٰۃ المصابیح، **باب الشفقہ**، حدیث:۴۲۵
۲۷۔ سورۃ المائدہ، آیت:۸
۲۸۔ سورۃ النحل:۹۰
۲۹۔ سورۃ النساء:۵۸
۳۰۔ سورۃ الانعام:۱۵۲
۳۱۔ سورۃ البقرہ، آیت:۱۹۴
۳۲۔ سورۃ النحل، آیت:۱۲۶
۳۳۔ جامع ترمذی، جلد:۱، ص:۱۵۷، سنن ابن ماجہ، جلد۱، ص:۱۰۳
۳۴۔ سورۃ الشوریٰ، آیت:۸
۳۵۔ سورۃ االبقرہ، آیت:۲۷۹
۳۶۔ سورۃ الشوریٰ، آیت:۲۵
۳۷۔ سورۃ البقرہ، آیت:۱۹۴
۳۸۔ سورۃ النحل، آیت:۱۲۶
۳۹۔ مسلم شریف، حدیث:۶۵۷۲
۴۰۔ سورہ بنی اسرائیل، آیت:۳۳
۴۱۔ سورۃ المائدہ، آیت:۳۲
۴۳۔ سورۃ البقرہ، آیت:۱۸۸
۴۳۔ سورۃ النساء آیت:۲۹
۴۴۔ سورۃ النحل، آیت:۱۲۵

۴۵۔ سورۃ البقرہ، آیت:۲۵٦
۴٦۔ سورہ کہف، آیت:۲۹
۴۷۔ سورہ یونس، آیت:۹۹
۴۸۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ ،جلد ا،ص:۳۵۷، ابن قیم، زادالمعاد، جلد۳،ص:٦۲۹،مکتبہ المنار الاسلامیہ، (کویت)۱۹۸٦ء
۴۹۔ السنن الکبریٰ، بیہقی ۸۔۳۰،مکتبہ دارالباز مکہ مکرمہ۱۹۹۴ء
۵۰۔ الدرالمختار، ابن عابدین شامی جلد:۳،ص:۲۷۴-۲۷۳
۵۱۔ احکام القرآن/جصاص جلد۴،ص:۸۹،دار احیاء التراث العربی۱۴۰۵ھ بیروت(لبنان)
۵۲۔ نصب الرایہ ،جلد۲ص۳۹۸۔عسقلانی، الدرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ،جلد:ا،ص:۲٦٦، دارالمعرفہ بیروت(لبنان)
۵۳۔ نصب الرایہ الاحادیث الھدایہ جلد۲،ص:۳۹۸(قاہرہ)
۵۴۔ بخاری کتاب الجھاد ، باب ماقال فی ذرع النبی والقمیص فی الحرب
۵۵۔ المغنی، ابن قدامہ، جلد۸،ص:۵۰۹، دارالفکر بیروت(لبنان)۱۴۰۵ء ابو یوسف، کتاب الخراج،ص:۱۵۰، دارالمعرفہ، بیروت(لبنان)
۵٦۔ سورۃ المائدہ، آیت:۵
۵۷۔ سیرت ابن ہشام، جلد۴،ص:۱۹۴،صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب الشاۃ التی سمت
۵۸۔ عبدالرزاق، المصنف ،۳۹۲/۱۰
۵۹۔ صحیح بخاری ، باب اذااسلم الصبی فمات، حدیث:۱۳۵٦
٦۰۔ رد المحتار علی الدر المختار ،جلد۵،ص:۱۴۳
٦۱۔ رد المحتار علی الدر المختار ،جلد۵،ص:۳۴۱
٦۲۔ سورۃ النساء، آیت:۳٦
٦۳۔ سنن ابوداؤد ،کتاب الادب، باب فی حق الجوار
٦۴۔ صحیح بخاری ،حدیث:۵٦۷۰
٦۵۔ صحیح بخاری ،حدیث:۵۷۹
٦٦۔ صحیح مسلم ، کتاب البر ،باب الوصیۃ بالجار والاحسان، حدیث:۲۱۹۲

انیس الرحمن قاسمی *

عہد ممالیک کے مصر میں علم وثقافت

مملوک عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنیٰ 'ملکیت' یعنی غلام کے ہیں۔ مصر اور شام کے غلام بادشاہوں کو ''مملوک'' کہا جاتا ہے۔ ممالیک سلاطین مصر کا دور اسلامی تاریخ کا ایک اہم دور تصور کیا جاتا ہے، وہ اس وجہ سے کہ یہ ممالیکِ مصر ہی تھے جنھوں نے سقوط بغداد کے بعد ہلاکو خان اور تاتاریوں کے لشکر کو شکست فاش دی اور نہ صرف اسلامی دنیا اور مصر وشام کو ان کی تباہ کاریوں سے بچایا بلکہ یورپ اور پوری دنیا کو ان کی تباہ کن یلغار اور پیش قدمی سے محفوظ رکھا، کیوں کہ اس زمانے میں ان سلاطین مصر کے علاوہ یورپ یا ایشیا کی کوئی سلطنت فوجی حیثیت سے تاتاریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ انھوں نے اس زمانے میں مصر میں اسلامی خلافت کا احیاء کیا جب سقوط بغداد کے بعد اسلامی خلافت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ گو یہ خلافت برائے نام تھی تاہم اس کی بدولت سلطنت مصر کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور اس کی وجہ سے دنیائے اسلام کے مشہور علماء وفضلاء ہجرت کر کے مصر وشام میں پناہ گزیں ہوئے اور انھوں نے اسلامی علوم وفنون کی شمعوں کو دوبارہ روشن کیا۔

سقوط بغداد اور عباسی خلافت کا خاتمہ اسلامی تاریخ کا سب سے المناک واقعہ ہے، یہ

* گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ای میل: anisurrahman1@jmi.ac.in

مسلمانوں کی تباہی کا آخری باب تھا، کیوں کہ اس سے پیشتر چنگیز خان اور اس کی اولاد ایران، خراسان، اور ترکستان کی اسلامی سلطنتوں اور ان کے بارونق شہروں کو فنا کر چکی تھی۔ ان المناک حادثات سے مسلم قوم نہ صرف مادی اور سیاسی حیثیت سے تباہ ہوئی بلکہ وہ اخلاقی، علمی اور روحانی حیثیت سے بھی مفلوج ہوگئی تھی۔ ان ممالک میں ہر طرف مایوسی اور محرومی کا دور دورہ تھا اور ان میں دشمن کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ باقی نہ رہا تھا۔ ایسے موقع پر ان 'ترک غلام' (مملوک) بادشاہوں اور ان کی فوج نے 'فتنۂ تاتار' کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور نہ صرف مصر و شام کو ان کی یلغار اور تباہ کاریوں سے بچایا بلکہ یورپ اور باقی ماندہ دنیا کو ان کے وحشیانہ حملوں سے محفوظ رکھا۔

ترک غلاموں کا دوسرا بڑا کارنامہ شام کے ساحل سے صلیبیوں کا اخراج ہے۔ اس طرح انھوں نے اس خطے کو کم از کم چھ سات سو سال تک بیرونی سازشوں اور اثرات سے محفوظ کر دیا۔

عہد ممالیک کا آغاز

بحری مملوک و برجی مملوک نے مجموعی طور پر ۱۲۵۰ء سے لے کر ۱۵۱۷ء تک مصر اور شام پر حکومت کی اور مصر و شام کے سیاہ و سفید کے مالک رہے۔ یہاں تک کہ عثمانیوں کے ذریعہ ان کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ مملوک پہلی بار نویں صدی میں خلافت عباسی میں نمودار ہوئے تھے اور عثمانیوں کے ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد بھی وہ مصری اسلامی معاشرے کا ایک اہم حصہ رہے اور انیسویں صدی تک ایک بااثر گروہ کے طور پر موجود رہے۔ انہوں نے کئی صلیبی ریاستوں کا خاتمہ کر دیا، نیز شام، مصر اور اسلام کے مقدس مقامات کو منگولوں سے بچایا۔ انھوں نے قرون وسطی میں قاہرہ کو عالم اسلام کا ایک بے نظیر و لاجواب شہر بنا دیا۔

مصر میں مملوک سلطنت نے ایوبی سلطنت سے جنم لیا جسے ۱۱۷۴ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے تشکیل دی تھی۔ مملوکوں نے اپنی صلاحیت و قابلیت سے خود کو دوسروں سے ممتاز کیا اور آہستہ آہستہ کاروبار سلطنت پر حاوی ہوتے چلے گئے۔ دوسری طرف سلطنت ایوبیہ میں آپسی رنجشیں اور دیگر خامیاں در آئی تھیں لہٰذا انہی کمزوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مملوک تخت سلطنت پر قابض ہوگئے۔ مصر کا پہلا ترک غلام (مملوک) بادشاہ المعز عزالدین ایبک تھا، وہ ماہ ربیع الاول کے اختتام پر ۶۴۸ھ میں تخت

نشین ہوا، اس طرح حکومت ایوبیوں سے مملوکوں میں منتقل ہوگئی۔

ممالیک بحریہ وبرجیہ

مملوک کے دو خاندانوں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی۔ ۱۲۵۰ء سے ۱۳۸۱ء (۶۴۷ھ سے ۷۸۴ھ) تک بحری مملوک نے حکومت کے نظام کو سنبھالا جب کہ ۱۳۸۲ء سے لے کر ۱۵۱۷ء (۷۸۴ھ سے ۹۲۲ھ) تک برجی مملوک غالب رہے۔

پہلی مملوک سلطنت کو بحری اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان مملوکوں کا تعلق بحری افواج سے تھا جن کا مرکز دریائے نیل کے جزیرۂ روضہ میں تھا، جب کہ دوسرے خاندان کو برجی مملوک اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ سلطنت ایوبیہ کے آخری سلطان الصالح کے لیے مملوکوں کے ذریعہ فراہم کی جانے والے خصوصی دستہ یا سپاہی تھے، جن کی انہوں نے ۱۲۵۰ء میں تختہ الٹنے سے پہلے خدمت کی تھی۔ برجی مملوک قاہرہ میں قلعے کے برجوں پر تعیناتی کے باعث برجی مملوک کہلاتے تھے۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ ترکی مملوک خلیفہ معتصم باللہ اور اس کے بعد احمد بن طولون کے عہد میں مصر آئے تھے، پھر عہد فاطمی میں ان کی کثرت ہوئی۔ ان مملوکوں کی مصر میں آمد کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ وہ روسی ممالک دشت قفچاق، قزوین اور کوہ قاف کے علاقوں سے تاتاری حملوں سے بچنے کے لیے بھاگ کر اسلامی ملکوں میں آگئے تھے۔ لوگوں نے مختلف جگہوں سے لے جا کر ان کو مصر میں فروخت کیا۔ ایوبی حکمراں ملک صالح نجم الدین نے خرید کر ان کی جنگی تربیت کے بعد اکثر کو اپنا درباری محافظ بنایا اور ان میں سے ہی امراء منتخب کیے۔ انھیں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا اور جزیرہ روضہ کے قریب رہنے کے لیے ان کو زمینیں عطا کیں جہاں انھوں نے عظیم الشان محلات اور قلعے تعمیر کرائے۔ چوں کہ اس مقام پر دریائے نیل کی دو شاخیں ملی ہیں جن کی وجہ سے وہ بحر کے نام سے مشہور ہوگیا ہے، اس لیے یہ ممالیک بحری کہلائے۔ ابن خلدون رقم طراز ہیں:

> ''اس قسم کے غلاموں کی پرورش اور ترقی کا آغاز سلطان صلاح الدین یوسف سلطان مصر و شام اور اس کے بھائی ملک عادل ابوبکر کے دور میں ہوا۔ پھر ان کی اولاد کے زمانے میں اس سلسلہ میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک

کہ ان کے آخری بادشاہ ملک صالح نجم الدین ایوب کے عہد میں (غلاموں کی پرورش اور ترقی کا) یہ سلسلہ اپنی انتہا تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ اس کی اکثر فوج انہیں غلاموں پر مشتمل تھی۔''[1]

اسلامی خلافت کا احیاء

سلطان قطز کے بعد سلطان ظاہر بیبرس بندقداری مصر وشام کا بادشاہ ہوا۔ وہ ممالیک خاندان کا عظیم بادشاہ تھا اور اس نے طویل عرصہ تک حکومت کی۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ بغداد سے عباسی خلافت ختم ہونے کے بعد اس نے بغداد کی عباسی خلافت کو مصر میں منتقل کیا، مصر کی یہ خلافت برائے نام تھی اور اسے مستقل اقتدار حاصل نہ تھا، تاہم اس کے ذریعے مصر کے ممالیک کی سلطنت کو مذہبی اور سیاسی طور پر استحکام حاصل ہوا اور خلیفہ کے وجود سے اس سلطنت کو عالم اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل ہوئی اور وہ مصیبت زدہ مسلمانوں کی پناہ گاہ بن گئی۔ نیز حجاز کے مقامات مقدسہ کی خدمت اور نگرانی کا کام بھی اسی سلطنت کے ذمے رہا۔ مصر کے ممالیک سلاطین اپنے غیر محدود اختیارات انہی خلفاء کے ذریعہ حاصل کرتے تھے۔[2]

گو یہ خلافت ڈھائی صدیوں سے اوپر قائم رہی لیکن اس کے خلفاء محض تبرکا تھے، اصل حکومت ممالیک کی تھی اور خلفاء ان کے وظیفہ خور تھے، ان کا کام صرف اس قدر تھا کہ ہر نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے بعد اس کو رسماً اپنی جانب سے امور مملکت کا مختار بنا کر خلعت عطا کرتے تھے۔ خلفاء عباسیہ کو کچھ بھی اختیارات حاصل نہ تھے، حکومت کے تمام امور کا فیصلہ ممالیک ہی لیا کرتے تھے۔ لیکن ترک کے عثمانی سلطان سلیم نے مصر پر قبضہ کر کے ان کی متحدہ سلطنت کا خاتمہ کر دیا تو اسلامی خلافت ترک سلاطین کی طرف منتقل کر دی گئی۔

عہد ممالیک کے ترقیاتی کام

ممالیک سلاطین کا عہد مصر کے فن تعمیر کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ کتب تاریخ کے صفحات مملوک سلاطین کے رفاہی کارناموں کے ذکر سے جگمگا رہے ہیں تو فی الواقع حیرت ہوتی ہے، ان کارناموں کی

فہرست بہت طویل ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج کے مصروشام میں مملوکوں کے آثار خیر میں سے محض چند ایک کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں، باقی سب فنا کے گھاٹ اتر گئے اور آج ان کا کوئی نام تک نہیں جانتا، زمانہ بدل گیا، ملکوں کی حدود بدل گئیں، مقامات کے نام بدل گئے اب تو ان ملکوں کے باشندے بھی ان کی کھوج لگانے سے قاصر ہیں دوسرا کوئی کیا لگائے گا۔ بہر حال سلاطین مصر کے رفاہی کارناموں کا ایک اجمالی خاکہ درج کیا جاتا ہے، گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را!

سڑکیں

سلطان قلاؤون نے نئی سڑکیں تعمیر کرانے اور قدیم سڑکوں کی مرمت کرانے پر خصوصی توجہ دی، اس طرح اس کے تمام ممالک محروسہ میں سڑکوں کا جال بچھ گیا جن سے نہ صرف عام لوگوں کو فائدہ پہنچا بلکہ فوجوں کی نقل وحرکت کے لیے بھی آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ آپ کے عہد میں مصروشام کے مراکز ایک عمدہ شاہراہ کے ذریعے ملا دیے گئے اور اس پر متعدد مقام پر چوکیاں اور سرائیں قائم کی گئیں۔ اس شاہراہ کے ذریعے ڈاک کی ترسیل اور سامان کی نقل وحمل نہایت تیزی کے ساتھ ہوسکتی تھی۔

اوقاف

مسلمان سلاطین میں دستور تھا کہ ایسی جاگیریں جو ان کی طرف سے مساجد، مدارس اور شفاخانوں وغیرہ کے متعلق مرحمت ہوتی تھیں علی العموم وقف سمجھی جاتی تھیں اور وقف میں شرعاً کسی کو تصرف کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے، چنانچہ جو بھی حکمراں مسند اقتدار پر بیٹھتا وہ کچھ نا کچھ اپنی طرف سے اضافہ کرتا تھا اور اگر اضافہ نہ کرسکتا تھا تو پرانے اوقاف کو ضرور قائم رکھتا تھا۔ اسی طرح ان کے امراء رفاہی کاموں کے لیے اپنی جاگیریں قائم کرتے رہتے تھے۔ اوقاف کی آمدنی لاکھوں دینار تک پہنچتی تھی اور اس کا بیشتر حصہ مدرسوں، شفاخانوں، مسجدوں، سرایوں اور مہمان خانوں پر صرف کیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے مدرسوں میں بڑی رونق تھی، مسجدیں آباد تھیں، شفاخانوں سے ہزاروں لوگ بغیر کسی خرچ کے فیض یاب ہوتے تھے، سرایوں اور مہمان خانوں میں مسافر اور اجنبی گھر جیسا آرام پاتے تھے، فی الحقیقت عہد ممالیک بالخصوص عہد قلاؤوں اور بیبرس میں علم کی اشاعت اور مخلوق خدا کو فیض پہچانے میں اوقاف

نے بڑا اہم رول ادا کیا۔

سلطان ظاہر بیبرس عوامی مفادات کا بہت خیال رکھتا تھا اور غریب عوام پر بے حد بخششیں اور سخاوت کرتا تھا، اس سلسلے میں "**النجوم الظاهرة**" کے مؤلف رقم طراز ہیں:

> ''وہ (سلطان بیبرس) ہر سال دس ہزار من گیہوں غریبوں، مسکینوں اور خانقاہ نشینوں پر صرف کرتا تھا۔ (جنگوں میں شہید ہونے کی وجہ سے) فوجیوں کے یتیم بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی، تاہم سلطان بیبرس نے معقول گزارہ کے لیے ان کے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک مخصوص وقف اس کام کے لیے مقرر کیا تھا کہ اس کے ذریعے ان مسافروں کی تجہیز و تکفین کی جائے جو قاہرہ اور مصر کے دیگر حصوں میں لاوارث ہو کر فوت ہو جاتے ہیں۔ سلطان موصوف نے ایک دوسرا وقف اس کام کے لیے مخصوص کر دیا تھا کہ اس کی آمدنی سے روٹیاں خرید کر فاقہ کش غریب مسلمانوں میں تقسیم کی جائیں''۔ [۳]

تعمیرات

عہد ممالیک میں قاہرہ میں نہایت خوش نما اور عمدہ عمارتیں کثیر تعداد میں تعمیر کی گئیں۔ ان عمارتوں میں جامع مسجد، مدارس و مکاتب، مقابر، حمام اور اسپتال وغیرہ سبھی قسم کی عمارتیں شامل ہیں۔ اس عہد کی عمارتوں میں سب سے خوبصورت عمارتیں وہ ہیں جن کا تعلق سلطان منصور قلاؤون کے عہد سے ہے۔ ان میں عجیب و غریب اور قابل دید مقبرۂ منصور قلاؤون کا وہ مثمن بُرج ہے جو آٹھ مختلف ستونوں پر قائم ہے۔ اس مقبرہ کی عمارت اور اس کے گنبد پر نہایت ہی خوبصورت نقاشی کی گئی ہے جو اسلامی فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ سلطان حسن کا مقبرہ اور مدرسہ بھی مصر میں اسلامی فن تعمیر کا زبردست شاہکار ہے۔ جب دنیا کے مشہور ماہر فن تعمیر فرانک لوید رائٹ نے اسے دیکھا تھا تو اس نے کہا تھا: ''یہ مصر میں اسلامی فن تعمیر کی سب سے خوبصورت یادگار ہے۔''

سلطان محمد بن قلاؤون نے ۷۱۱ھ میں مصر میں نئی جامع مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا اور اس کے

لیے نفع بخش اوقاف مقرر کئے، پھر سلطان موصوف نے ۷۱۴ھ میں شاہی محل قصر ابلق کی تعمیر کا حکم دیا، جو ایک شاندار محل تھا۔ ۷۱۸ھ میں قلعہ کی جامع مسجد کی توسیع کا حکم دیا گیا چنانچہ اس مسجد کے چاروں طرف کے گھروں کو مسمار کر کے اس کی اس قدر توسیع کی گئی کہ وہ ایک عظیم الشان مسجد بن گئی۔ ۷۲۳ھ میں سلطان کے حکم پر سریا قوس میں بادشاہ کی رہائش کے لیے محلات تعمیر کرائے گئے۔ ان محلات کی تعمیر کے بعد ان کے سامنے ایک بڑی خانقاہ تعمیر کی گئی جو سلطان کے نام سے ہی منسوب ہے۔ ۷۳۳ھ میں محمد بن قلاؤون نے حکم دیا کہ شاہی قلعہ کے اندر ایک عظیم الشان ہال تعمیر کیا جائے جہاں وہ دربار منعقد کرے اور وہیں اس کا تخت شاہی ہو۔ اس کا نام دارالعدل رکھا گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ممالیک سلاطین نے ان عمارتوں کے علاوہ بھی بہت ساری شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں جن سے مصر وشام کو دنیا کے نقشے پر ایک نئی پہچان مل گئی۔

اسی عہد میں مصر نے سنگ تراشی اور فن تعمیر میں خوب ترقی کی۔ وہ شام اور فلسطین کے عیسائیوں کے طرز کے فن تعمیر سے بھی واقف ہوئے، نیز وہ سلجوقی فن تعمیر سے بھی روشناس ہوئے جو آرمینیوں اور بازنطینیوں کے سنگ تراشی کے تعمیری فن پر مبنی تھا۔ لہٰذا انہوں نے ان تمام تجربات سے فائدہ اٹھایا اور عمدہ وعالیشان عمارتوں کی بنیاد رکھی، نیز منگولوں کے حملے سے بچ کر مختلف ممالک خاص طور پر موصل، بغداد اور دمشق سے جو مسلمان کاریگر وصنعت کار بھاگ کر مصر پہنچے انہوں نے یہاں سکونت اختیار کی، جس کی وجہ سے یہاں کے فن تعمیر میں کچھ نئے انداز کی عمارتیں وجود میں آئیں، مثلاً اینٹ کی جگہ پتھر کا استعمال کیا جانے لگا، خوبصورت اور مزین گنبد تعمیر کیے گئے، خوبصورتی اور سجاوٹ کے لیے مختلف رنگ کے پتھروں کا استعمال کیا گیا۔ فلپ خوری حتی لکھتے ہیں:

> ''شامی تعمیرات میں عربی فنون کے بعض نہایت خوبصورت اور دلکش نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس نمونے کی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں: عمارت میں پائیداری اور پختگی، آرائش کی افراط اور بہتات، اس کی آرائشیں نہایت عمدہ پتھر کی پائیدار سلوں پر بہت ہی خوبی اور دل کشی پیدا کر لیتی ہے۔''[۴]

ان کے علاوہ مؤرخین نے جن تعمیرات کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ **پل**: ملک کے ہر گوشے میں دریاؤں، ندی نالوں اور نہروں پر پل تعمیر

کروائے، پل دو قسم کے تھے۔

شاہی پل: یہ پل ملک کے عام مفاد کے لیے بنائے گئے تھے اور لگان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ان پر خرچ کیا جاتا تھا۔

مقامی پل: یہ پل، بلدیہ کہلاتے تھے، ان کا مفاد مقامی تھا اور ان کی تعمیر کا خرچ مقامی کاشت کاروں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

فلپ کے حتی نے ''تاریخ شام'' میں لکھا ہے کہ سلطان نے دریائے اردن پر ایک شان دار پل بنوایا اس پر اپنا کتبہ لگوایا اور اس کتبے کے دونوں جانب شیر نصب کرائے (بیبرس کا طغرا شیر ببر تھا)۔

یہ پل آج بھی موجود ہے اور ''جسر الدامیہ'' کے نام سے مشہور ہے، یہ پل اب خشک زمین پر واقع ہے کیونکہ یہاں دریا نے اپنا رخ بدل لیا ہے، سلطان بیبرس نے یہ پل ۱۲۶۶ء میں بنوایا تھا۔[۵]

جہاز سازی کے کارخانے: سلطان بیبرس نے اسکندریہ اور دمیاط میں جنگی جہاز بنانے کے لیے عظیم الشان کارخانے قائم کیے اور ان کے لیے خام مال (لکڑی لوہا وغیرہ) مہیا کرنے کے خاص انتظامات کیے۔ اس نے ان تمام لکڑیوں کے استعمال کی ممانعت کر دی تھی جو جہاز سازی کے کام آسکتی تھیں۔

بندرگاہوں کی اصلاح: سلطان نے مصر و شام کی کئی بندرگاہوں کی اصلاح کی اور ان میں تجارتی اور جنگی جہازوں کے لیے زیادہ گنجائش پیدا کی۔ دمیاط کی بندرگاہ کو جسے لوئی نہم کی صلیبی مہم نے تباہ کر دیا تھا از سر نو تعمیر کرایا۔

سرائیں اور مہمان خانے: سلطان بیبرس نے قاہرہ، اسکندریہ، دمشق، حلب اور کئی دوسرے مقامات پر متعدد سرائیں اور مہمان خانے تعمیر کرائے جن میں ہر مذہب وملت کے مسافر استفادہ کر سکتے تھے۔

محضر روضۂ نبوی: سلطان بیبرس ۶۶۷ھ میں حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ گئے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگ قبر نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام سے بہت قریب آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس میں کسی قدر سوئے ادب پایا جاتا تھا۔ سلطان نے قبر مبارک کے چاروں طرف ایک محضر بنوا دیا

جوابھی تک موجود ہے۔

مساجد: مساجد کی تعمیر ومرمت کے سلسلے میں سلطان کو جو سب سے بڑی سعادت نصیب ہوئی وہ مسجد نبوی کے ایک حصے کی مرمت وتعمیر تھی۔ یہ حصہ چند سال قبل آگ لگنے کی وجہ سے گر گیا تھا۔ بغداد کے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ نے اس کی تعمیر شروع کرائی لیکن سقوط بغداد کی وجہ سے یہ کام ادھورا رہ گیا تھا۔ سلطان بیبرس نے برسر اقتدار آنے کے بعد اس کام کی طرف توجہ کی اور نہایت محبت وعقیدت کے ساتھ اس حصے کو مکمل کرایا۔

تاتاریوں کے حملے میں شام کی کئی مسجدوں کو نقصان پہنچا تھا سلطان نے ان سب کی مرمت کروائی یا از سر نو تعمیر کروائی۔ اسی طرح دوسری تاریخی مساجد کی بھی مرمت کروائی جن میں " **قبة الصخراء**" بھی شامل ہے، قاہرہ کی جامع ازہر کی عمارت بہت مخدوش ہوگئی تھی، اس کی اس طرح مرمت کروائی کہ اس کی گزشتہ شان وشوکت بحال ہوگئی نیز اس کے لیے کچھ مخصوص اوقاف مقرر کیے۔

۶۶۵ھ میں سلطان بیبرس نے قاہرہ میں ایک عظیم الشان مسجد بنانے کا حکم دیا، اس مسجد کی تعمیر کا کام دو سال تک جاری رہا، جب یہ بن کر تیار ہوئی تو سلطان نے اس کو "**جامع حسنیه**" کا نام دیا اور اس میں حنفی خطیب مقرر کیا۔"[۶]

قلعے اور شہر پناہیں: تاتاری یورش میں شام کے کئی قلعوں اور شہر پناہوں کو سخت نقصان پہنچا تھا، سلطان نے خاص اہتمام سے ان کی مرمت کرائی اور ان کو پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط بنا دیا، ان میں حلب، حماۃ اور دمشق کے قلعے اور شہر پناہیں قابل ذکر ہیں، سلطان نے صلیبیوں کے اکثر قلعے فتح کرنے کے بعد مسمار کرا دیے تھے، لیکن جب اس نے ۱۲۷۱ء میں "**حصن الاکراد**" کا ناقابل تسخیر قلعہ فتح کیا تو اس کو مسمار کرنے کے بجائے اس کی دوبارہ مرمت کرائی اور وہاں اپنا کتبہ نصب کرایا۔[۷]

شفاخانے: مصر وشام میں عہد مملوک سے پہلے ہی کثرت سے شفاخانے قائم تھے۔ ان میں سب سے بڑا شفاخانہ (اسپتال) دمشق کا بیمارستان الکبیر النوری تھا جو سلطان نور الدین زنگی نے چھٹی صدی ہجری میں قائم کیا تھا، نیز قاہرہ اور اسکندریہ میں دو بڑے بڑے اسپتال صلاح الدین ایوبی نے قائم کیے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دمشق کے بیمارستان الکبیر جب سے قائم ہوا تھا اس کے چولھے کی آگ کبھی نہیں بجھی تھی، اس میں امیر، غریب، مقیم ومسافر، غلام وآزاد سب کا علاج مفت ہوتا تھا، اور مریض کی ہر

ضرورت کا خیال رکھا جاتا تھا۔اس کی ایک خاص بات اور تھی کہ یہاں طب (میڈیکل سائنس) کی تعلیم بھی دی جاتی تھی جس میں تشخیص امراض، علاج اور ادویہ سازی سبھی کچھ شامل تھا۔

ان شفاخانوں کے علاوہ حلب، حماۃ، حمص اور ملک کے دیگر حصوں میں بھی کئی اچھے شفا خانے موجود تھے اور ان تمام شفاخانوں کی مملوک سلاطین نے بھرپور سرپرستی کی۔

بیمارستان الکبیر المنصوری

سلطان منصور قلاؤون نے قاہرہ میں ۶۸۳ھ/۱۲۸۵ء میں ایک عظیم الشان ہسپتال کی بنیاد رکھی جس کی تکمیل ۱۲۹۳ء میں اس کے بیٹے سلطان ناصر نے کی جو بیمارستان الکبیر المنصوری کے نام سے مشہور ہوا۔ واقعہ یوں ہوا کہ صلیبی جنگوں کے وقت وہ قولنج کی بیماری میں مبتلا ہوگیا جس کے علاج کے لیے اسے دمشق میں نورالدین زنگی کے تعمیر کردہ بیمارستان الکبیر النوری میں داخل کرایا گیا جس سے یہ بہت متاثر ہوا، اثنائے مرض اس نے منت مانی تھی کہ اگر وہ شفایاب ہوگیا تو قاہرہ میں ایک عدیم المثال ہسپتال قائم کرے گا۔ چنانچہ صحت یاب ہوکر اس نے اپنا عہد پورا کیا اور لاکھوں دینار کے صرفہ سے بیمارستان الکبیر المنصوری قائم کیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے بہت سے مقامات کا معائنہ کیا۔ آخر کار اسے فاطمی خلفاء کے محلوں میں سے دو محلوں کے قریب **الدار القطبیہ** کا مقام پسند آیا اور اس نے وہاں ہسپتال قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اصل حویلی کو ہسپتال کے لیے مقرر کیا اور اس کے سامنے اس نے علوم وفنون کی تعلیم کے لیے اعلیٰ درس گاہ اور اپنے لیے ایک مقبرہ کی تعمیر تجویز کی۔ ان سب کی تعمیر وتکمیل کے لیے اس نے علم الدین شجاعی کو مقرر کیا۔ چنانچہ اس نے بہت جلد یہ تمام عمارتیں تعمیر کرادیں۔ جب ہسپتال مکمل ہوگیا تو ایک مقررہ دن کے موقعہ پر وہ ہسپتال پہنچا اور ایک طبی شربت کا پیالہ پی کر کہا: ''میں نے یہ ہسپتال اپنے اور اپنے سے کمتر (ہر خاص وعام) مخلوق کے لیے وقف کردیا ہے'' چنانچہ یہ ہسپتال اس کی نہایت عمدہ یادگار ہے۔[۸]

اس میں ہر مرض کے لیے علاحدہ علاحدہ کمرے اور وارڈ تعمیر کروائے، اس کے لیے سرائیں، دکانیں، زمینیں وقف تھیں جن کی آمدنی سے ان کا خرچ پورا کیا جاتا۔ اسی سے ملحق یتیم خانہ، مدرسہ اور مقبرہ بھی تھا، جہاں تعلیم کا بندوبست تھا۔[۹]

اس میں مریض داخل ہوتا تو جب تک وہ مکمل شفایاب نہ ہوجاتا حکومت اس کے خرچ کی ذمہ دار ہوتی، اگر وفات ہوجاتی تو تجہیز وتکفین بھی اسپتال سے ہوتا، اور جب کوئی مریض شفایاب ہوکر اپنے گھر کولوٹنے لگتا تو اسے ایک جوڑا کپڑا مرحمت کیا جاتا۔ اس اسپتال میں خواتین کا وارڈ علاحدہ تھا۔ انگلستان کے مشہور مستشرق ایڈورڈ جی براؤن نے اس ہسپتال کے بارے میں لکھا ہے:

''بیمارستان الکبیر المنصوری کے اخراجات پورے کرنے کے لیے تقریبا دس لاکھ درہم (موجودہ دور میں کروڑوں میں یہ رقم ہوگی) سالانہ کے اوقاف مقرر تھے اور یہ ہسپتال تمام مریض انسانوں، امیروں، غریبوں، عورتوں اور مردوں کے لیے بلاتخصیص عام تھا اور اس میں عورتوں کے لیے بھی ایسے ہی علیحدہ کمرے (Wards) بنائے گئے تھے جیسے مردوں کے لیے اور بیمار عورتوں کی تیمارداری کے لیے ویسے ہی تربیت یافتہ عورتیں (نرسیں) مقرر کی گئی تھیں جیسے مردوں کے لیے تربیت یافتہ تیماردار اور خدام مقرر تھے۔ اس ہسپتال میں ایک بڑا وارڈ مختلف قسم کے بخار کے مریضوں کے لیے مخصوص تھا، ایک وارڈ صرف امراض چشم میں مبتلا لوگوں کے لیے تھا، ایک وارڈ جراحی سے تعلق رکھنے والے مریضوں (Surgical Cases) کے لیے تھا اور ایک وارڈ پیچش اور اس نوع کے دوسرے امراض کے مریضوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے علاوہ اس ہسپتال میں باورچی خانے، درس وتقریر کے کمرے (Lacture Rooms) طبی آلات اور دواؤں کی ذخیرہ گاہیں (Store Rooms) اور اطباء نیز دوسرے عملہ کے رہنے کے مکانات بھی تھے۔ ان کے علاوہ ایک دواخانہ (Dispensary) بھی تھا''۔[۱۰]

اس ہسپتال کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے جوسف ہل لکھتے ہیں:

"Whatever medical science could do to make residence in the hospital happy was done. Different diseases were treated in different

wards. To the insane particularly, pleasant apartments were allotted. The sick were lodged, as each case needed, in the southern or the northern portion of the hospital. They were artificially warmed or cooled, and special stress was laid on fresh air, for, said they, "man needs to eat from time to time only, but breathe always he must."[11]

عہد ممالیک میں علمی خدمات

ممالیک مصر کا عہد افسوسناک خانہ جنگیوں، بغاوتوں، جوڑ توڑ اور سیاسی سازشوں کے باوجود مسلمانوں کا شاندار علمی دور ہے کیوں کہ یہی متحدہ سلطنت مصر وشام اور مسلمان اہل علم وفضل کی پناہ گاہ تھی۔ ایران وخراسان اور ترکستان کے مشرقی ممالک، تاتاری حملوں اور یلغار کی وجہ سے تباہ وبرباد ہوگئے تھے اور وہاں کے علمی مراکز ومدارس، کتب خانے، مساجد وخانقاہیں بھی نیست ونابود ہوگئیں تھیں، نیز بغداد، عراق وعرب اور الجزیرہ ودیار بکر کے علاقے بھی تباہ ہوگئے تھے اور اب صرف شام ومصر کے علاقے ہی ایسے تھے جہاں ان مذکورہ ممالک کے علماء کو پناہ ملی اور وہ فراغت کے ساتھ تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہوئے۔ اسی وجہ سے یہاں بے شمار تعلیمی مدارس، خانقاہیں اور کتب خانے قائم ہوئے۔

مصر وشام کی اس متحدہ سلطنت نے صلیبیوں کا خاتمہ کردیا تھا اور تاتاریوں کے حملے کا مقابلہ نہایت جوانمردی، جرأت وہمت کے ساتھ کررہی تھی، چنانچہ اس سلطنت میں بڑی حد تک امن وامان رہا اور اہل علم وفضل ان سلاطین کی قدردانی اور سہولتوں کی بدولت تعلیم وتدریس میں مشغول رہے اور اس کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں انھوں نے مختلف علوم وفنون کی معیاری کتابیں تحریر کیں جو نہ صرف مدارس میں نصابی کتابوں کا کام دیتی تھیں بلکہ علمی طبقے میں بھی بہت مقبول ہوئیں۔ فتنۂ تاتار کے بعد مسلمانوں کا جو علمی خزانہ باقی رہ گیا تھا انہیں اسی دور کے علماء وفضلاء نے سمیٹا اور مختلف علوم ومعارف پر جامع کتابیں، موجودہ انسائیکلوپیڈیا قسم کی کتابوں کی طرز پر لکھی گئیں، چنانچہ آج کل جو مشہور ومستند ضخیم عربی

کتابیں نظر آتی ہیں وہ سب اسی دور کی پیداوار ہیں۔

مملوک سلاطین میں کئی حکمراں جیسے ملک الظاہر بیبرس، منصور قلاؤون اور ملک الناصر محمد بن قلاؤون وغیرہ صاحب علم اور شائستہ حکمراں تھے۔ان کی سرپرستی میں مصر وشام نے ہر اعتبار سے ترقی کی اور خوشحالی کے عروج پر پہنچے، بالخصوص تجارت کو فروغ ہوا اور فن تعمیر نے بہت ترقی کی۔

سقوط بغداد کے بعد اسلامی ممالک میں علوم وفنون کا خاتمہ ہوگیا تھا اور مسلمانوں کی کتابیں اور ان کے کتب خانے ناپید ہوگئے تھے اور اس تباہی کی قربان گاہ پر مسلمانوں کی کتابیں اور ان کے علماء وفضلاء بھینٹ چڑھ گئے تھے، اس لیے نہایت سرگرمی کے ساتھ علمی احیاء کی ضرورت تھی چنانچہ ممالیک سلاطین مصر نے علمی ترقی کے لیے تمام ضروری اسباب فراہم کئے۔

عہدِ ممالیک اپنی فتوحات کے لیے جانا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس دور میں علوم وفنون پر بھی نہایت اعلی پیمانے کے کام ہوئے۔حکمرانوں اور وزیروں نے علوم وفنون کو خوب ترقی دی۔اس دور میں نہ صرف حدیث وفقہ، فلسفہ ومنطق وغیرہ سے متعلق کام ہوئے بلکہ علم طب اور سائنس نے بھی خوب ترقی کی۔تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ اس دور میں علوم طب، فلکیات، ریاضی وجغرافیہ، سوانح نگاری، تاریخ نویسی، ادب ولٹریچر اور لسانیات پر بے پناہ تحقیقی کام ہوئے۔مملوک سلاطین علم دوست اور معارف نواز فرماں روا تھے انھوں نے اہل علم کی سرپرستی اور قدردانی خوب دل کھول کے کی، چنانچہ ان کی سلطنت میں علماء، فضلاء، فقہاء، صلحاء، فلاسفہ، مجتہدین، مؤرخین، ادباء، حکماء واطباء اور دوسرے اہلِ فن وہنر کا ایک ایسا بے نظیر اجتماع ہوگیا تھا کہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔ان سے قبل سلطان نور الدین محمود زنگی اور ایوبی سلاطین (بالخصوص سلطان صلاح الدین) مصر وشام میں سینکڑوں مدارس اور کتب خانے قائم کر چکے تھے جن میں سے بیشتر بیبرس کے عہد تک نہایت حسن وخوبی سے چل رہے تھے۔سلطان نے ان مدارس کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ ان میں بہت سے مدرسوں کا اضافہ بھی کیا۔ تاتاریوں کی یورش میں شام کے جن مدرسوں کو نقصان پہنچا تھا سلطان نے ان کی از سرنو تعمیر یا مرمت کروائی اور ان کو پرانی صورت پر بحال کر دیا۔ان مدارس کے لیے سلطان نے لاکھوں دینار آمدنی کی جاگیریں وقف کیں اور اس کے امراء نے اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ان تعلیمی اداروں میں تعلیم وتدریس کی خدمات پر مشہور علماء کرام کو مقرر کیا گیا جو تعلیمی

خدمات کے ساتھ ساتھ علمی تحقیقات اور تصنیف وتالیف کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

عہد ممالیک میں قاہرہ، اسکندریہ، دمشق، حلب، حماۃ، حمص اور بعلبک وغیرہ میں سینکڑوں مدارس تشنگان علم کو سیراب کر رہے تھے، ان میں سے چار مساجد یعنی جامع عمرو بن العاص، جامع ابن طولون، جامع حاکم اور جامع ازہر ایسی تھیں جو ماقبل ممالیک بھی اعلیٰ تعلیمی مراکز کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی چند ایسے ادارے تھے جنہیں مملوک حکمرانوں نے قائم کیا تھا اور جہاں اسلامی دنیا کے دور دراز علاقوں سے طلبہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ مثلاً بیبرس نے 'المدرسة الظاهريه' نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ اسی طرح 'المدرسة المنصورية' کو منصور قلاؤون نے قائم کیا تھا، یہاں چاروں فقہی مسالک کی تعلیم دی جاتی تھی نیز طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ 'القبة المنصورية' منصور قلاؤون کا قائم کردہ ایک عظیم الشان تعلیمی ادارہ تھا۔

اس کے علاوہ 'المدرسة الناصريه' کی بنیاد العادل زین الدین کتبغا نے رکھی تھی لیکن اس کی تکمیل محمد بن قلاؤون کے عہد میں ۷۰۳ھ میں ہوئی۔ "المدرسة الناصريه" قبة المنصوريه کے قریب مشرقی سمت میں اس جگہ واقع تھا جہاں حمام تھا۔ یہ مدرسہ سلطان ناصر کے نام سے منسوب ہے۔ اسی طرح شام میں ظاہر بیبرس نے "المدرسة الظاهريه" قائم کیا تھا۔ ان سلاطین نے ان کے اخراجات کے لیے مصر وشام کی بہت سی جائدادیں اور اراضی وقف کیں۔[۱۲]

ان کے علاوہ قاہرہ کے مدرسه صلاحيه، شافعيه، فحميه، زين التجار شريفيه، مشهد امام حسين، سوفيه. دمشق کے مدرسہ نوریہ، عادلیہ، ابن عمر، جامع دمشق، رکنیہ، رواحیہ، مالکیہ، عصمیہ، ۔حلب کے مدرسہ ابن شداد اور شاد بخت اور بعلبک کے مدرسه النجميه کو شہرت عام حاصل تھی۔

علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ قاہرہ کا مدرسہ الظاہریہ سلطان بیبرس نے ۶۶۲ھ میں بڑے اہتمام سے تیار کرایا اور اس میں علامہ تقی بن رزین کو فقہ شافعیہ کی تدریس کے لیے اور امام شرف الدین دمیاطی کو حدیث کی تدریس کے لیے مقرر کیا۔[۱۳]

سلطان کی مملکت کے دوسرے مدارس میں بھی اس دور کے سربرآوردہ علماء وفقہاء تعلیم دیتے تھے اور حکومت کی طرف سے ان کے معقول مشاہرے مقرر تھے۔ طلبہ کی رہائش، خورد ونوش، لباس اور

دوسری ضروریات کا خرچ بھی حکومت برداشت کرتی تھی۔ جو لوگ ان درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہوتے تھے ان کو سرکاری ملازمتوں میں لے لیا جاتا تھا اور اگر وہ سرکاری ملازمت اختیار نہ کرنا چاہتے تو اپنی مرضی اور ذوق کے مطابق کوئی پیشہ اختیار کر سکتے تھے۔ ان پیشوں میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

ملک الظاہر بیبرس اور منصور قلاؤوں کی طرح سلطان ناصر نے بھی رفاہ عامہ کے بے شمار کام انجام دیئے، تاریخ ابن خلدون میں درج ہے:

> ''سلطان ناصر نے مساجد ومدارس، خانقاہوں اور مقابر کی تعمیر کرا کے فن تعمیر کے نادر نمونے پیش کیے جو اس کی زندہ جاوید یادگاریں ہیں۔ اس کے عہد میں سیاسی کشمکشوں، جوڑ توڑ اور سیاسی سازشوں اور رقابتوں کے باوجود علوم وفنون کی بہت ترقی ہوئی اور مشہور علماء وفضلاء کا چشمۂ فیض تعلیمی درسگاہوں کی صورت میں مصر وشام میں جاری رہا۔''[۱۴]

جامع عمرو بن العاص

جامع عمرو بن العاص افریقہ کے پورے علاقے اور مصر میں قائم کی جانے والی پہلی مسجد اور اسلامی مرکز ہے۔ یہ مسجد مصر کے فسطاط شہر میں واقع ہے جسے مسلمانوں نے مصر فتح کرنے کے بعد ۶۴۱ء میں تعمیر کی تھی۔ اس مسجد کو مسجد فتح، مسجد عتیق اور تاج الجوامع بھی کہا جاتا ہے۔ جامع عمرو بن العاص دریائے نیل کے مشرقی حصے میں واقع ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے شہر فسطاط کو آباد کر کے دارالامارۃ قرار دیا تھا۔

جامع عمرو بن العاص کو عہد فاروقیؓ میں مصر کے شہر فسطاط میں حضرت عمرو بن العاصؓ نے قائم کیا تھا اور روز اول سے ہی وہاں قرآن، حدیث اور فقہ کا درس ہوا کرتا تھا۔ یہ مسجد اپنی پہلی تعمیر کے وقت ۵۰x۳۰ کی جگہ پر واقع تھی اور اس کے چھ دروازے تھے۔ سال ۵۳ھ مطابق ۶۷۲ء تک مسجد عمرو ابن العاص اپنی پہلی تعمیر پر قائم رہی۔ حضرت امیر معاویہؓ کے حکم پر مسلمہ بن مخلد الانصاری نے اس میں اذان دینے کے لیے چار منبروں کا اضافہ کیا۔ اس کے بعد پے در پے مختلف عہدوں میں مسلسل اصلاحات اور

توسیع کا کام جاری رہا اور آج مسجد عمرو ابن العاص ۱۱۰ میٹر لمبائی اور ۱۲۰ میٹر چوڑائی پر مشتمل ہے۔

سال ۵۶۴ھ میں صلیبیوں کی مسلم ممالک پر یلغار کے بعد وزیر شاور کو فسطاط شہر پر صلیبیوں کے قبضہ کا خوف ہوا تو اس نے دفاع کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے فسطاط شہر میں دانستہ آگ لگا دی، جس کے نتیجے میں پورا فسطاط شہر آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ مسجد عمرو بن العاص بھی آتشزدگی کا شکار ہوئی۔ جب صلاح الدین ایوبی نے مصر کو اپنی حکومت میں شامل کیا تو سال ۵۶۸ھ میں مسجد عمرو بن العاص کی تعمیر نو کا حکم صادر کیا، لہٰذا مسجد کے سامنے والے حصہ اور محراب کبیر کی تعمیر نو کی گئی، اس میں سنگ مرمر استعمال کیا گیا اور اس پر مختلف نقوش نقش کیے گئے۔

لیکن مرور زمانہ کے ساتھ اس میں کمی واقع ہوئی تو پھر عہد قلاؤون میں اس کی تعمیر و مرمت کا کام ہوا اور پھر باقاعدہ تعلیم و تدریس ہونے لگی۔

جامع عمرو بن العاص کو وقت کے بڑے بڑے علما و ائمہ کے درس و تدریس اور خطاب و موعظت کا شرف حاصل ہے۔ مثلاً محمد بن ادریس الشافعی، لیث بن سعد، ابو طاہر السّلفی، العز بن عبد السلام، ابن ہشام (صاحب السیرۃ)، محمد الغزالی، ابی اسحاق الحوینی، یاسر البرہامی، سعید عبد العظیم، عبد الرحمٰن عبد الخالق، محمد العریفی رحمہم اللہ وغیرہ نے وہاں مسند درس و تدریس کو رونق بخشی۔

اس میں بہت سے زاویے (گوشے) قائم تھے۔ ان میں سے ایک گوشہ امام شافعیؒ کی طرف منسوب تھا، اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں امام شافعی نے اپنے قیام مصر کے زمانے میں درس دیا تھا۔ دوسرا زاویہ 'الزاویۃ المجدیہ' کے نام سے مشہور تھا، یہ ملک الاشرف موسیٰ بن عادل کے وزیر مجد الدین کی طرف منسوب ہے۔ تیسرا زاویہ 'الزاویۃ الصاحبیۃ' تھا، جو الصاحب تاج الدین محمد بن فخر الدین کی طرف منسوب ہے۔ اس کے علاوہ مصر کے امراء نے جامع عمرو بن العاص کے مختلف گوشوں سے اپنے مقرر کردہ اوقاف کی مدد سے تعلیم کا انتظام کیا اور ہر گوشہ اس امیر سے منسوب ہوتا تھا جو اس کے تعلیمی اخراجات کے لیے وقف کا انتظام کرتا تھا۔ یوں یہ جامع مسجد اس زمانے میں ایک یونیورسٹی کی حیثیت حاصل کر چکی تھی۔ واضح رہے کہ جامع عمرو بن العاص مصر کی سب سے قدیم تعلیمی درسگاہ ہے جہاں جامع ازہر سے بہت پہلے تعلیم و تدریس جاری تھی اور ممالیک سلاطین مصر کے دور میں بھی یہاں کے تعلیمی حلقوں میں اضافہ ہوا۔

جامع ابن طولون

جامع ابن طولون مصر کے شہر قاہرہ میں واقع ہے۔ یہ اصل حالت میں اب تک محفوظ رہنے والی اس شہر کی قدیم ترین مسجد ہے۔ اور بلحاظ رقبہ قاہرہ کی سب سے بڑی مسجد ہے۔

احمد بن طولون نے اپنے عہد حکومت میں اس کی تعمیر کروائی تھی، اس میں نماز کے علاوہ درس وتدریس بھی ہوا کرتی تھی، مشہور عالم دین ربیع بن سلیمان کی مجلس میں آ کر لوگ مختلف علوم وفنون کے مسائل تحریر کرتے تھے۔

۶۹۶ھ میں منصور حسام الدین لاچین نے اس جامع مسجد کی از سر نو تعمیر کرائی اور اس کی تمام خرابیوں اور خامیوں کو دور کیا نیز اس کا پختہ فرش تعمیر کرایا اور اس میں سفیدی کرائی۔ اس کام کے لیے اس نے علم الدین سنجر کو نگراں مقرر کیا، اس نے اس کے تعمیری اخراجات کے لیے اپنے ذاتی مال سے ایک لاکھ بیس ہزار دینار کا عطیہ دیا، اور اس کے لیے جائیدادیں اور اراضی وقف کیں۔[۱۵]

اس کے بعد اس نے چاروں مشہور فقہی مذاہب کے مطابق درسِ فقہ کا انتظام کیا، نیز فقہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تفسیر قرآن کریم، حدیث اور طب کی تعلیم کا انتظام بھی کیا۔

الجامع الازہر

فاطمی حکومت کے چوتھے خلیفہ ''المعز لدین باللہ'' شمال افریقہ سے بحر اٹلانٹک تک کی ریاست کو فاطمی حکومت کے تحت لانے کے بعد مصر کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے مصر کو اپنی حکومت کے تحت لانے کے لیے اپنے غلام ''جوہر صقلی'' کو ایک ہزار فوج کا رئیس بنا کر اس کی طرف روانہ کر دیا۔ جس نے فاس اور سلجماسہ وغیرہ کی فتوحات سے بڑی عظمت حاصل کر لی تھی۔ اس کے ہاتھوں فاطمی حکومت کو ۱۷ شعبان ۳۵۸ھ مطابق ۹۶۹ء میں مصر پر فتح حاصل ہوئی۔ مصر کی نئی راجدھانی کے لیے ''جوہر صقلی'' ہی نے ایک مسجد کی بنیاد رکھی اور اس کا نام ''جامع القاہرۃ'' رکھا، کچھ صدی کے بعد یہ مسجد ''جامع القاہرۃ'' کی بجائے ''الجامع الازہر'' کے نام سے مشہور ومعروف ہوئی۔

اس مسجد کی بنیاد ۲۴/ جمادی الاولی ۳۵۹ھ / اپریل ۹۷۰ء میں رکھی گئی اور ۷/ رمضان

۳۶۱ھ/۲۳ جون ۹۷۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔اس میں نماز کے علاوہ علوم وفنون کا درس بھی ہوا کرتا تھا،عزیز کے عہد میں اس میں علمی کتابوں کا ایک ذخیرہ جمع کیا گیا۔اس جامعہ نے زمانہ مابعد میں بہت ترقی کی اور اسلامی علوم اور عربی زبان وادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

سلاطین اور امراء نے اس پر بڑے بڑے اوقاف مقرر کیے،آج تک یہ جامع قائم ہے،اور دنیا کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔اس کے طلبہ کی تعداد بیس لاکھ سے بھی زائد ہے،جس میں ہر ملک اور ہر قوم کے طلبہ یہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں،تقریباً چار ہزار تعلیمی ادارے اس سے متعلق ہیں۔

فاطمی حکومت کے دور ۹۶۹ء سے ۱۱۷۰ء تک تشیع کے افکار وتعلیمات غالب رہیں،مگر جب ۱۱۷۱ء میں مصر کی باگ وڈور سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھ میں آئی،تو اہل سنت والجماعت کے افکار وعقائد غالب ہوئے۔یہ ایک مسجد کے ساتھ ساتھ درس گاہ بھی تھی جہاں فقہاء،علماء وفضلاء درس قرآن وحدیث دیا کرتے تھے اور بادشاہوں کی طرف سے اس کے اخراجات کے لیے اوقاف مقرر تھے۔

عہد ایوبی اور ممالیک سلاطین کے عہد میں مسجد کے ساتھ ساتھ درس گاہ کا کام بھی اس سے لیا جاتا رہا۔سلطان ظاہر نے جامع ازہر کی از سرنو تعمیر کا حکم دیا اور ہدایت کی کہ وہاں خطبۂ جمعہ پڑھا جائے۔یہ جامع ازہر ایک سو سال سے ویران پڑی ہوئی تھی۔[16] پھر ۷۶۱ھ میں امیر سعید الدین نے جامع ازہر کو از سرنو آباد کیا جہاں یتیموں اور غریبوں کی تعلیم کا نظم کیا۔اس مقصد کے لیے اس نے کئی اوقاف مخصوص کر رکھے تھے۔

جامع حاکم

جامع حاکم مصر کے دار الحکومت قاہرہ میں واقع ایک مسجد ہے جو فاطمی دور حکومت کی سب سے بڑی مسجد ہے۔اس مسجد کی تعمیر کا آغاز ۹۹۰ء میں فاطمی سلطان العزیز باللہ کے عہد میں ہوا جب کہ الحاکم بامر اللہ کے عہد حکومت ۳۹۳ھ/۱۰۱۳ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔اسی وجہ سے اسی کی طرف یہ منسوب ہے۔حاکم بامر اللہ کو خاصہ علمی ذوق تھا چنانچہ اس نے بغداد کے بیت الحکمۃ کے مقابلہ میں اپنے قصر کے

متصل دارالحکمۃ کے نام سے ایک عمارت بنوائی تھی جس میں ہر علم وفن کی کتابیں جمع تھیں تا کہ لوگ آ کر مطالعہ کریں اور جس کتاب کی چاہیں نقل لیں۔ ناقلین کو جملہ سامان کتابت خود دارالحکمۃ سے فراہم کیا جاتا تھا، اس عمارت کا ایک حصہ اہل علم کے بحث ومباحثہ کے لیے مخصوص تھا جس میں خود حاکم بھی شریک ہوتا اور جس کی تقریر یا قابلیت اس کو پسند آتی اس کو خلعت وانعام سے نوازتا۔ فاطمی خلافت کے خاتمہ کے بعد بھی جامع حاکم کی اہمیت برقرار رہی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنے عہد میں اس مدرسے کو مدرسہ شافعیہ بنا دیا۔ اس میں کتابوں کی تعداد ایک لاکھ سے کم نہ تھی۔ ۷۰۳ھ میں بیبرس نے اس کی اصلاح کی اور چاروں سنی مسلک کی فقہ کی تعلیم کا انتظام کیا۔

عہد ممالیک کی چند باکمال شخصیات

ممالیک مصر نے جہاں ایک طرف فن تعمیر کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تو دوسری طرف علمی کارناموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور علم کے ہر میدان میں بھی خوب خوب ترقی کی۔ اس عہد میں کبار علماء، فلاسفر، مؤرخین اور سائنس دانوں نے عظیم الشان کارنامے انجام دیئے، میڈیکل سائنس میں عظیم تجربات کئے گئے اور اس فن پر نادر کتابیں تصنیف کی گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور مسلمان تمام علوم وفنون بالخصوص میڈیکل سائنس، کیمیا، طبیعیات، جغرافیہ وغیرہ میں نئے نئے تجربات کر رہے تھے۔ انہوں نے ایسی بیش بہا کتابیں تصنیف کیں جن سے یورپ آج بھی استفادہ کر رہا ہے۔

جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا گیا کہ عہد ممالیک میں سقوط بغداد کے بعد علوم وفنون کا احیاء ہوا۔ تمام اسلامی ممالک کے ماہرین مصر وشام میں پناہ گزیں ہو گئے تھے اور انہوں نے عربی زبان میں ہر علم وفن پر بہترین کتابیں تحریر کیں۔ خود مصر وشام میں اس دور کے بہترین علماء وفضلاء اور محققین پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے علمی شاہکار سے عربی زبان کو مالا مال کیا اور تمام علوم پر نہایت وقیع تصانیف منظر عام پر آئیں۔

اس دور میں بہت سے مشاہیر علم وفضل پیدا ہوئے جنہوں نے تمام مروجہ علوم میں کتابیں تحریر کی تھیں، تاہم اس دور کے مصر وشام میں خصوصیت کے ساتھ اسلامی علوم کا بہت چرچا رہا۔ اسلامی علوم کے مراکز حجاز وعراق اور ایران وخراسان سے منتقل ہو کر مصر وشام میں آ گئے تھے کیوں کہ یہاں علماء کی قدردانی

عوام اور حکومت دونوں کی طرف سے ہوتی تھی اور ان کی حق گوئی اور صداقت ضرب المثل بن گئی تھی۔

عہد ممالیک کے نامور علماء محققین میں سے علامہ ابن خلکان، سید احمد البدوی، ابن واصل، شیخ الاسلام امام عزالدین دمشقی، ابن عبدالظاہر، علامہ ابن منظور، سبط ابن الجوزی، قاضی جمال الدین مالک طائی، قاضی تقی الدین بن رفیق العبد (مصر کے چھ سال تک قاضی رہے، ان کی وفات کے بعد قاضی بدرالدین ابن جماعہ قاضی بنائے گئے) [۱۷] ابن شداد حلبی، قاضی عبدالرحمٰن بن قدامہ، ابوشامہ مقدسی، ابن ابی اصیبعہ، ابن النفیس، قاری جمال الدین، شیخ القراء کمال الدین مصری، شیخ محمد بن مکی صقلی، ابوالفضل مہندس دمشقی طبیب، امام نووی وغیرہ نے علمی دنیا کو سیراب کیا۔ اسی دور میں علامہ ذہبی نے حدیث وتاریخ اور اسماء الرجال پر اپنی تصانیف تحریر کیں۔ علم تفسیر وحدیث میں اس دور کی تصانیف حرف آخر ثابت ہوئیں اور بعد کے ادوار میں علماء اور طالبان علم ان سے مستفید ہوتے رہے۔

ابن حجر عسقلانی

ابن حجر عسقلانی ماہر حدیث وفقہ تھے۔ ان کی پیدائش ۷۷۳ھ/۱۳۷۲ء قاہرہ میں ہوئی۔ شمس الدین ابن القطان، علامہ بلقینی، ابن الملاقین اور عبدالرحیم بن حسین العراقی آپ کے مشہور اساتذہ میں سے ہیں۔ ابن حجر کو کئی بار سلاطین مصر کی جانب سے قاضی مصر کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔

ان کی کتابوں کی تعداد ۱۵۰ سے زائد بتائی جاتی ہے۔ ان کی مشہور زمانہ کتاب ''فتح الباری'' ہے جو صحیح البخاری کی ایک مستند شرح تسلیم کی جاتی ہے۔ اصول حدیث اور اسماء الرجال میں ان کی تصانیف علم حدیث کا بہترین سرمایہ ہیں، جیسے **الدرالکامنة، الاصابة فی تمییز الصحابة، شرح نخبة الفکر، التقریب التهذیب، بلوغ المرام من ادلة الأحکام** وغیرہ۔

محی الدین نووی

یحییٰ بن شرف محی الدین نووی ۶۳۱ھ/۱۲۳۳ء میں علاقہ دمشق کے موضع نویٰ (نوا) میں پیدا ہوئے۔ حفظ قرآن کے بعد دمشق میں طب اور علوم اسلامیہ کی تکمیل کی، پھر دمشق کے مدرسہ اشرفیہ میں برسوں علم حدیث پڑھاتے رہے۔ چند سالوں میں تمام دنیاء اسلام میں آپ کے علم وفضل کی شہرت

ہوگئی۔امام نووی کا شمار بہت بڑے محدثین میں ہوتا ہے وہ نقد احادیث میں بہت سخت تھے۔انہوں نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں کی شرحیں لکھیں،صحیح مسلم کی شرح "المنھاج" کے نام سے لکھی جو علمی دنیا میں کافی مقبول ہوئی۔اس کی تصنیف کے زمانے سے آج تک علماء اس سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔اگر چہ یہ شرح بڑی مفصل ہے اور علماء کے نزدیک اس کو جامع علوم کا درجہ حاصل ہے اس کے باوجود امام موصوف اس شرح کی بابت لکھتے ہیں:

"لو لا ضعف الهمم وقلة الراغبين لبسطته فبلغت به ما يزيد على مائة من المجلدات."[۱۸]

اگر لوگوں کی ہمتیں کمزور نہ ہوگئی ہوتیں اور علم کے راغب کم نہ ہوگئے ہوتے تو میں اس شرح کو مبسوط کر کے لکھتا اور یہ سو جلدوں تک پہنچتی۔

اس شرح میں امام موصوف نے علم وتاریخ حدیث پر سیر حاصل بحث کی ہے۔اس کے علاوہ امام موصوف کی مشہور تصانیف، **رياض الصالحين، بستان العارفين، منهاج الطالبين، كتاب الاربعين، كتاب الاذكار، تهذيب الاسماء واللغات** ہیں، نیز انھوں نے علم نحو اور فن تذکرہ پر بھی کتابیں تصنیف کیں۔۶۷۶ھ/ ۱۲۷۷ء میں ان کی وفات ہوئی۔

شمس الدین ذہبی

شمس الدین ذہبی اپنے وقت کے جلیل القدر عالم، محدث ومؤرخ گزرے ہیں۔۱۲۷۴ء کو دمشق میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۸ء میں وفات پائی۔

ملک شام کے نامور علماء ومحدثین سے کسب فیض کیا۔مثلا ابن دقیق العید، یوسف بن عبد الرحمٰن المزی، علم الدین البرزالی، ابن تیمیہ اور ابوبکر بن عبد الحکم آپ کے سرفہرست اساتذہ میں سے ہیں۔آپ اسماء الرجال کے ماہر تھے۔

آپ کی تصانیف کی ایک لمبی فہرست ہے، **تذكرة الحفاظ ، ميزان الاعتدال فى نقد الرجال، سير أعلام النبلاء، طبقات الحفاظ، تهذيب التهذيب، المثبت فى الاسماء والانساب، المقتنى فى الضعفاء،اختصار سنن بيهقى،نعم السمر(سيرت حضرت**

عمرؓ) التبیان (مناقب حضرت عثمانؓ) فتح الطالب (اخبار علی ابن ابی طالب) تاریخ الاسلام و الطبقات المشاهیر و الاعلام وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

ان کے علاوہ اس دور کے مشہور و نامور محدثین و مجتہدین میں سے الدمیاطی، ابن شامہ، ابن دقیق، السبکی، شیخ عزالدین ابن عبدالسلام، ابن منیر الاسکندری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

علامہ عینی کی "شرح بخاری" اور ابن القیم کی تصانیف بھی اسی دور میں لکھی گئیں یہ اپنے دور کے عظیم ترین فضلاء اور مجددین میں سے تھے۔ علامہ ابن کثیر نے اپنی مشہور "تفسیر ابن کثیر" اور "البدایه و النهایه" جو تاریخ کی ایک مستند کتاب مانی جاتی ہے اسی دور میں تصنیف کی۔

جلال الدین سیوطی: یہ اس دور کے مشہور علماء میں سے تھے، جنہوں نے تفسیر، فلسفہ، منطق اور تاریخ وغیرہ پر کئی کتابیں تصنیف کیں، اصول قرآن پر ان کی مشہور کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" نہایت ہی مستند کتاب شمار کی جاتی ہے۔ اسی طرح ان کی "تاریخ الخلفاء" اور "المحاضرة فی ملوک مصر و قاهره" تاریخ کی مشہور کتابیں ہیں۔

نحو و بلاغت میں جمال الدین ابن مالک کی "کتاب الخلاصه الفیة"، جمال الدین ابن ہشام کی "مغنی اللبیب"، علم بلاغت میں جرجانی کی "اسرار البلاغة" اور "دلائل الاعجاز" اور محمد بن علی سکاکی کی "مفتاح العلوم" اسی دور میں لکھی گئیں۔ جلال الدین قزوینی نے "تلخیص المفتاح" لکھی جو متن کی حیثیت سے مدارس میں بہت مقبول ہوئی، نیز اس کی شروح "مختصر المعانی" اور "مطول" تمام اسلامی ممالک میں داخل نصاب رہیں۔ ابن منظور افریقی کی کتاب "لسان العرب" نہایت ضخیم اور مستند لغت ہے جو عربی زبان کی بہترین لغت سمجھی جاتی ہے۔ اس کے مؤلف کی وفات ۷۱۱ھ میں ہوئی۔

تقی الدین احمد عبدالحلیم ابن تیمیہ

ابن تیمیہ کی پیدائش ۶۶۱ھ/۱۲۶۳ء کو ترکی کے علاقے حران میں ہوئی۔ یہ ایک مشہور عالم، فقیہ، محدث، الٰہیات داں، مصنف، فلسفی، ماہر معاشیات اور جامع العلوم تھے۔ ۷۲۸ھ ملک شام میں بحالت قید و بند ان کا وصال ہوا۔

انھوں نے قلم اور تلوار دونوں سے جہاد کیا۔ انھوں نے مسلم حکمرانوں اور عوام کو صلیبیوں سے جنگ پر ابھارا اور مسلمانوں میں جو غلط رسومات ورواج، غلط عقائد ونظریات در آئے تھے ان کا رد کیا۔ ان کی مشہور کتابیں: " **الرد علی المنطقیین، جواب الصحیح، منهاج السنة، الجوامع، السیاسة الشرعیة، الجمع بین العقل و النقل** وغیرہ ہیں۔

علوم اسلامیہ کے علاوہ دیگر علوم وفنون پر کارہائے نمایاں انجام دینے والے چند دیگر باکمال شخصیات کا تذکرہ یہاں مناسب ہوگا۔

ابن النفیس

علم طب (میڈیکل سائنس) کے ماہرین میں سے ایک نام ابن النفیس کا بھی ہے، جن کا پورا نام علاء الدین ابوالعلاء ابن نفیس ہے۔ ان کی پیدائش ۱۲۳۳ء میں ہوئی اور ۱۲۸۸ء میں انتقال ہوا۔ کم عمری میں ہی قرآن مجید کو حفظ کرنے کے بعد علم حدیث وفقہ اور تفسیر وفلسفہ کی طرف متوجہ ہوئے، تقریبا ۲۲ رسال کی عمر میں علم طب کی طرف دلچسپی ہوئی اور انھوں نے اس وقت کے ایک ماہر طب مہذب الدین الدخوار (صلاح الدین ایوبی کے عہد میں قاہرہ کے اسپتال میں رئیس الاطباء کے عہدے پر فائز تھے) سے علم طب کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے علاوہ عمران اسرائیلی اور رضی الدین سے بھی طب کی تعلیم حاصل کی۔

ابن نفیس نے یونانی فلاسفر اور اطباء جالینوس، بقراط، بطلیموس، اور مسلم اطباء ابن سینا، زکریا رازی وغیرہ کی بازیافت پر عمدہ ریسرچ پیش کی۔ ابن سینا کی کتاب "**القانون**" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو زبانی یاد تھی۔

انھوں نے قاہرہ کے اسپتال کے افسر اعلی (رئیس الاطباء) کی حیثیت سے کام کیا۔ یہ علاج کے ساتھ ساتھ درس بھی دیا کرتے تھے۔ یعنی میڈیکل سائنس کے پروفیسر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے۔

ان کے علاج کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے غذا سے علاج کرتے، اگر اس سے شفا نہ ملتی تو منفرد دواؤں سے علاج کرتے، اگر اس سے بھی شفا نہ ملتی تو مرکب دواؤں سے علاج کرتے۔ انھوں نے علم

طب پر کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے چند مشہور کتابوں کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا۔

ان کی تصانیف میں سب سے زیادہ متداول" موجز القانون" ہے یعنی ابن سینا کی کتاب القانون کا وہ نسخہ جسے عملی مقاصد کے لیے مختصر کر دیا گیا ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۲۸ء میں طبع ہوا، برسوں تک اس پر بے شمار شرحیں اور شرحوں کی شرحیں لکھی جاتی رہیں۔

شرح تشریح القانون: یہ ابن سینا کی کتاب القانون کے ایک حصہ کی تشریح ہے۔

المهذب فی الکحل: انھوں نے امراض چشم سے متعلق یہ کتاب لکھی ہے۔

ابن نفیس کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے خون کی گردش (Pulmonary Circulation) کا درست نظریہ پیش کیا۔ یہ ایسے پہلے سائنس داں ہیں جنھوں نے جالینوس کے گردش خون کے نظریہ کا رد کیا۔

الشامل فی الطب: اس کتاب میں انہوں نے خون کی گردش کے بارے میں لکھا ہے کہ کس طرح خون پھیپھڑوں تک جاتا ہے اور وہاں سے آکسیجن لے کر دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی تین سو جلدیں ہوتیں لیکن یہ نامکمل رہ گئی اور اس کا کوئی حصہ بھی باقی نہیں رہا لیکن الزکلی نے الاعلام میں لکھا ہے کہ اس کا ایک مخطوطہ دمشق میں موجود ہے۔[19]

ان کی ایک کتاب غذا سے متعلق بھی ہے جس میں انہوں نے غذا کے فوائد و نقصانات پر روشنی ڈالی ہے۔

اپنے فن سے ان کی رغبت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حمام میں غسل کر رہے تھے اور نبض کے مسئلہ پر سوچ رہے تھے کہ ذہن میں یہ خیال آیا اور غسل چھوڑ کر پہلے اس کو تحریر کیا پھر واپس غسل کے لیے آئے۔

ان کی وفات ۱۲۸۸ میں ہوئی۔ جب یہ مرض الوفات میں مبتلا تھے تو ڈاکٹر نے ان کے لیے دوائی کے طور پر شراب تجویز کی، انھوں نے منع کر دیا کہ میں اس حالت میں خدا کے سامنے پیش نہیں ہوسکتا کہ میرے پیٹ میں شراب ہو۔

ابن القُف

امین الدولۃ بن یعقوب ابن القف بھی اس عہد کے ایک بڑے سائنس داں اور ماہر طب

تھے۔۱۲۳۳ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ابن ابی اصیبعہ نے ان کی بہت تعریف کی ہے۔ان کی تصانیف میں بقراط پر "**کتاب الاصول فی شرح الفصول**" بہت مشہور ہے۔وہ ایک کامیاب اور نامور سرجن بھی تھے۔انھوں نے سرجری پر ایک کتاب تصنیف کی "**کتاب العمدۃ فی صناعۃ الجراح**"۔اس میں انھوں نے خون کی شریانوں اور قلب (Heart) کے آپریشن پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ علم طب میں "**کتاب الشافی**" بھی ان کی ہی تصنیف ہے۔

خلیفہ ابن ابی محاسن

"**الکافی فی الکحل**" نامی کتاب لکھ کر دنیا کو ایک عظیم سوغات دینے والے امراض چشم کے ماہر ابن ابی محاسن بھی اسی دور کے پروردہ ہیں۔انہیں اپنے علم پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک ایسے انسان کے آنکھ کی انھوں نے سرجری کی جس کی ایک آنکھ پہلے سے خراب تھی اور دوسری میں موتیا بند تھا۔انھوں نے اس کے موتیا بند کی کامیاب سرجری اور علاج کیا۔امراض چشم پر دوسری کتاب "**نور العیون و جامع الفنون**" اسی دور میں تصنیف کی گئی جس کے مصنف صلاح الدین بن یوسف ہیں، وہ ۱۲۹۶ھ کے عرصے میں حماۃ میں تھے۔یہ لوگ اسلامی علوم وفنون کی روشنی کے آخری دور میں تھے۔

ابن ابی اصیبعہ

فن طب میں عربی دنیا کے مشہور مؤرخ موفق الدین ابن ابی اصیبعہ کا تعلق بھی اسی عہد سے ہے۔وہ دمشق کے ایک علمی خاندان میں ۶۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔درس وتدریس اور طب ومعالجہ کے ماحول میں تربیت پائی۔علمی اور نظری تعلیم دمشق اور قاہرہ میں پائی، آپ کے مشہور اساتذہ میں سے ابن الدخوار ہیں جنہوں نے بیمارستان نوری میں طب کی خدمات انجام دیں، نیز مشہور نباتاتی عالم اور "**جامع المفردات**" کے مصنف ابن البیطار بھی ان کے اساتذہ میں شامل ہیں، آپ بیمارستان ناصری میں خدمات انجام دیتے رہے۔ابن ابی اصیبعہ اپنی کتاب "**عیون الانباء فی طبقات الاطباء**" سے مشہور ہوئے جو آج بھی عربوں کے ہاں طب کی تاریخ کا سب سے بڑا مصدر سمجھی جاتی ہے۔یہ تقریباً چار سو عربی اور یونانی اطباء کی سیرتوں پر مشتمل ہے جن میں سے بہتیرے فلسفی، ہیئت داں تھے یا طبیعیات

وریاضیات کے ماہر تھے۔

ابن الشاطر

الحسن بن علی بن ابراہیم جو ابن شاطر کے لقب سے جانے جاتے ہیں، آٹھویں صدی ہجری کے قدآور ریاضی داں تھے، دمشق میں ۷۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۷۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ایک ماہر فلکیات اور ریاضی داں تھے۔ آلاتِ رصد اور علمِ فلکیات کے سائنس داں کے طور پر انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ انھیں مغرب میں بہت کم پہچانا جاتا ہے کیونکہ ان کے کام کا ترجمہ لاطینی زبان میں نہیں ہوا تھا۔

تاہم ۱۹۸۰ء کی دہائی کے دوران محققین نے الشاطر کے سیاروں کا ماڈل دریافت کیا اور انھیں احساس ہوا کہ یہ وہی ماڈل ہے جو کوپرنیکس نے کچھ صدیوں بعد تجویز کیا تھا۔ اسی طرح ایک دوسرے ریاضی داں محمد بن احمد نے ریاضی کی مختلف شاخ پر خاص طور سے "**الجبرا**" پر تحقیقی کام کیے۔

ابن ماجد

اس دور کے اہم جغرافیہ داں میں شہاب الدین احمد ابن ماجد (۱۴۳۲ء۔۱۵۰۰ء) کا شمار ہوتا ہے۔ یہ جغرافیہ داں کے علاوہ جہاز رانی کے بھی ماہر تھے۔ اس نے علم بحریات پر ایک ایسی کتاب تصنیف کی تھی جس میں بحر ہند، بحر قلزم، خلیج فارس، بحیرہ چین کے مغربی حصے اور مجمع الجزائر میں جہاز رانی کی ہدایات درج ہیں۔

جہاز سازی نیز اس سے متعلق مختلف آلات کے بھی موجد ہیں، اس عرب جہاز راں کی ملاقات مشہور سیاح واسکوڈی گاما سے ہوئی تھی۔ انھوں نے واسکوڈی گاما کو ہندوستان کے بحری راستوں کا علم نیز کچھ ضروری آلات سے بھی نوازا تھا۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ ابن ماجد کے جہاز رانی کے آلات مجھ سے بہتر تھے۔ اہلِ یورپ اس کے بحری معلومات کے معترف ہیں اور اسے عربوں کا جان ہملٹن کہتے تھے۔

ان کی مشہور کتاب "**کتاب الفوائد**" ہے، ابن ماجد کو مؤرخین نے اڑتیس کتابوں کا

مصنف بتایا ہے جن میں سے اکثر فلکیات، بحریات اور جہاز رانی کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ فرانسیسی مستشرق فیراں لکھتا ہے کہ جہاز رانی اور بحری علوم پر جدید انداز میں لکھنے والا پہلا مصنف ابن ماجد ہے۔آج بھی بادبانی جہاز کے لیے اس کی کتابیں بے مثال ہیں۔

سوانح نگار

عہدِ ممالیک میں سوانح نگاری پر بھی نہایت مستند اور عمدہ کام ہوئے ،اس عہد میں بڑے بڑے سوانح نگار پیدا ہوئے، چند معروف سوانح نگار کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

شمس الدین احمد بن محمد بن خلکان (۱۲۱۱ء تا ۱۲۸۲): اس دور کے مشہور سوانح نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔مشہور زمانہ کتاب "**وفیات الأعیان و ابناء الزمان**" انہی کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے عظیم مسلم شخصیات کا ذکر کیا ہے۔

اسی دور میں ایک اور مشہور سوانح نگار صلاح الدین خلیل صفدی ہیں جن کا زمانہ ۱۲۹۶ء تا ۱۳۶۶ء ہے۔آپ کی پیدائش فلسطین کے شہر صفاد میں ہوئی۔انھوں نے علوم اسلامیہ و دیگر علوم میں کمال مہارت حاصل کی۔آپ کے اساتذہ کرام کی فہرست میں ابوحیان الغرناطی، تقی الدین سبکی، یوسف بن عبد الرحمٰن المزی، بدر الدین بن جماعہ، علامہ ذہبی، ابن تیمیہ، بن سید الناس قابلِ ذکر ہیں۔آپ مؤرخ، سوانح نگار، شاعر اور ادیب تھے۔

آپ نے پچاس جلدوں میں "**الوافی بالوفیات**" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں تقریباً ۱۴ ہزار مشہور لوگوں کی سوانح مذکور ہے۔یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں کسی ایک سوانح نگار نے اتنے لوگوں کے حالات نہیں لکھے ہیں۔[۲۰]

تاریخ نویس

اس دور میں تاریخ نگاری پر بھی کافی کام ہوئے۔مشہور تاریخ نگار جو دیگر علوم میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے، ابوالفداء، المقریزی، السیوطی، ابن کثیر، ابن خلدون، طغری بردی وغیرہ ہوئے ہیں۔

ابن خلدون

عبدالرحمٰن ابن خلدون (۱۳۳۲ء۔۱۴۰۶ء) عالم اسلام کے مشہور ومعروف مؤرخ، فقیہ، فلسفی اور سیاست داں تھے۔ ان کی پیدائش تیونس میں ہوئی، تعلیم سے فراغت کے بعد تیونس اور پھر غرناطہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے بعدازاں مصر تشریف لائے اور جامع الازہر میں درس وتدریس پر مامور ہوئے۔ مصر میں انہیں منصب قضا تفویض کیا گیا۔ اسی عہدے پر انھوں نے وفات پائی۔ یہ سلطان سیف الدین برقوق کے دور سے تعلق رکھتے ہیں اور سلطان برقوق کے بہت خاص تھے۔

ابن خلدون کو تاریخ اور عمرانیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ انھوں نے "**کتاب العبر ودیوان المبتداء والخبر**" کے نام سے اپنے زمانے تک کی تاریخ لکھی جسے دنیا "**تاریخ ابن خلدون**" کے نام سے جانتی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ "**مقدمة فی التاریخ**" ہے جو مقدمہ ابن خلدون کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقدمہ تاریخ، سیاست، عمرانیات، اقتصادیات اور ادبیات کا گراں مایہ خزانہ ہے۔

مصر اور شام کے مؤرخین میں ابوالمحاسن یوسف بن تغری بردی کا نام بہت نمایاں ہے جن کی "**تاریخ النجوم الزاهرة فی اخبار ملوک مصر وقاهره**" بہت مشہور ہوئی۔ یہ ممالیک مصر کے حالات سے متعلق نہایت مستند کتاب شمار کی جاتی ہے۔ انھوں نے اس میں مصر پر عربوں کے حملے سے لے کر اپنے زمانے تک کی تاریخ درج کی ہے۔ نیز ان کی '**المنهل الصافی**' کا شمار اہم اور مستند کتابوں میں ہوتا ہے۔ جس میں مشاہیر کے حالات رقم ہیں۔ تاریخی تذکروں میں محمد ابن شاکر الکتبی کی "**فوات الوفیات**" بھی نہایت عمدہ کتاب ہے۔

اسماعیل بن علی بن محمود ابوالفداء: (۱۲۷۳ تا ۱۳۳۱ھ) یہ حاکم وقت بھی تھے۔ مؤرخ کے علاوہ یہ جغرافیہ داں بھی تھے۔ انھوں نے زمین کے گول ہونے کا دعویٰ کیا تھا، علم جغرافیہ پر "**تقویم البلدان**" ان کی مشہور کتاب ہے۔ اس کے علاوہ "**تاریخ ابو الفداء**" جس میں انھوں نے اپنے زمانہ کی تاریخ رقم کی ہے اور "**تاریخ دولة الخوارزمیه**" بھی ان کی اہم تصانیف میں شمار کی جاتی ہے۔

عربی ادب وشاعری میں مشہور نام "البصیری" کا ملتا ہے، بصیری نے "**البردہ**" کے نام سے

ایک نظم لکھی تھی جو بہت مشہور ہوئی، کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے، اسے عربی زبان کا شاہکار مانا جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں یہ نظم انھوں نے تخلیق کی تھی۔

ابن واصل

جمال الدین محمد بن سالم ایک عرب مؤرخ، جو ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ وہ پہلے حماۃ میں مدرس تھے، پھر ۱۲۶۱ء میں اسے قاہرہ بلایا گیا اور بیبرس نے اسے بادشاہ منفرد کے پاس صقلیہ میں سفیر بنا کر بھیج دیا۔ انھوں نے وہاں خاصی مدت گزاری اور مبادی علم منطق پر ایک رسالہ تالیف کیا جس کا نام "**نخبة الفكر فى المنطق**" ہے۔ واپسی پر وہ حماۃ کے قاضی القضاۃ اور مدرس مقرر ہوئے، جہاں ۱۲۹۸ء میں ان کی وفات ہوئی۔ انہوں نے ایوبی خاندان کی ایک تاریخ، بعنوان "**مفرج الكروب فى اخبار بنى ايوب**" نیز ایک تاریخ عالم "**التاريخ الصالحى**" تصنیف کی۔[۲۱]

حواشی وحوالہ جات

۱۔ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون، **كتاب العبر وديوان المبتداء والخبر** (تاریخ ابن خلدون) نفیس اکیڈمی اردو بازار، کراچی (پاکستان) ۲۰۰۳ء، جلد نہم، ص:۲۹

۲۔ ایضاً، ص:۱۸

۳۔ ابوالمحاسن یوسف بن تغری بردی، **تاريخ النجوم الزاهرة فى اخبار ملوك مصر وقاهره، دارالكتب العلمية، بيروت** (لبنان) ج:۷، ص:۱۶۲

۴۔ فلپ کے حتی، تاریخ شام اردو ترجمہ، مترجم غلام رسول مہر، پبلشرز غلام علی کراچی (پاکستان) ۱۹۶۲ء، ص:۵۲۰

۵۔ طالب ہاشمی، الملک الظاہر بیبرس، القمر انٹر پرائزز، لاہور (پاکستان) ص:۲۵۴

۶۔ ایضاً، ص:۲۵۶

۷۔ ایضاً، ص:۲۵۶

۸۔ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون، **كتاب العبر وديوان المبتداء والخبر** (تاریخ ابن خلدون) نفیس اکیڈمی اردو بازار، کراچی (پاکستان) ۲۰۰۳ء، جلد نہم، ص۳۷

۹۔ Philip .K. Hitti, History of the Arab, Macmilan Education Limited,London، Page678

۱۰۔ طب العرب، مرتبہ حکیم علی احمد نیر واسطی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور (پاکستان) ۱۹۹۰ء، ص:۱۴۸۔۱۴۹۔ (یہ

کتاب ایڈورڈ جی براؤن کے لکچروں کا اردو ترجمہ ہے)

۱۱۔ Joseph Hell, The Arab civilization, kashmiri Bazar Lahore,1925 , P. 128

۱۲۔ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون، **کتاب العبر ودیوان المبتداء والخبر** (تاریخ ابن خلدون) نفیس اکیڈمی اردو بازار، کراچی (پاکستان) ۲۰۰۳ء، جلد نہم، ص ۴۷

۱۳۔ طالب ہاشمی، الملک الظاہر بیبرس، القمر انٹر پرائزز، لاہور (پاکستان) ص: ۲۵۰

۱۴۔ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون، **کتاب العبر ودیوان المبتداء والخبر** (تاریخ ابن خلدون) نفیس اکیڈمی اردو بازار، کراچی (پاکستان) ۲۰۰۳ء، جلد نہم، ص ۲۳

۱۵۔ ایضاً، ص: ۸۲

۱۶۔ ایضاً، ص: ۵۲

۱۷۔ ایضاً، ص: ۹۵

۱۸۔ **مقدمه صحیح مسلم بشرح النووی، الجزء الاول، المطبعة المصرية بالازهر**، ۱۹۲۹ء، ص: ۵

۱۹۔ اردو دائرۃ المعارف، دانش گاہ پنجاب لاہور (پاکستان) ۱۹۸۷ء، ج: ۱، ص: ۱۹۷

۲۰۔ ملا کاتب جلبی المعروف بہ حاجی خلیفہ، **کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون، دار احیاء التراث العربي، بیروت**، ۲۰۰۰ء

۲۱۔ اردو دائرۃ المعارف، دانش گاہ پنجاب لاہور (پاکستان) ۱۹۸۷ء، ج: ۱، ص: ۲۰۷

محمد اسامہ *

اسلام کے اہم سیاسی افکار: عالمی تناظر میں

موجودہ دور میں اسلام کے سیاسی تصورات پر از سرنو غور کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ اس حوالے سے زیادہ تر مسائل اور مباحث اس زمانے کے ہیں جب مسلمان دنیا میں غالب تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ فقہی کتابیں 'مسلمان بہ حیثیت اقلیت' کے موضوع پر کم ہی نظر آتی ہیں۔ آج صورت حال بالکل اس کے برعکس ہے اور بدقسمتی سے مسلمان مغلوب ہو چکے ہیں۔ ایسے حالات میں انسانی ذہنوں میں چند بنیادی سوالات ضرور اٹھتے ہیں کہ اب جب کہ دنیا ایک 'عالمی گاؤں' میں تبدیل ہو چکی ہے تو کیا اسلام کا پیش کردہ سیاسی نظام قابلِ عمل ہے؟ اگر ہے تو اسلامی ریاست کا بنیادی ڈھانچہ کیا ہوگا؟ خلیفہ کا انتخاب کیسے ہوگا؟ اور وہ ایک ہوگا یا ایک سے زائد؟ موجودہ جمہوری نظام کو اسلام قبول کرتا ہے یا نہیں؟ موجودہ تناظر میں اسلامی ریاست میں عورتوں کی کیا پوزیشن ہوگی؟ ان کو ووٹ دینے کا حق ہوگا یا نہیں؟ انھیں کوئی اہم سرکاری عہدہ دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ زیرِ نظر مقالے میں ان ہی سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ واضح رہے کہ اس مقالے میں موضوع سے متعلق قدیم و جدید دونوں علماء کے افکار و نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام کا سیاست

* گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵ ای میل: musama1@jmi.ac.in

سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ کیوں کہ اس حوالے سے مسلم معاشرے میں کافی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔

دین اور سیاست

وقت کا ایک اہم ترین سوال یہ ہے کہ دین کا سیاست سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں اہل علم اور مفکرین تین بڑے طبقوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔ پہلا مذہبی طبقہ کے چند لوگ ہیں جن کے لیے دنیوی علوم اور جدید مسائل 'شجرِ ممنوعہ' سے کم نہیں ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ سیاست وغیرہ میں حصہ لینا دنیاوی عمل ہے، نیز اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسرا جدت پسند طبقہ ہے جو مغربی افکار کا حامی ہے، اس کا خیال ہے کہ دین اور سیاست کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے اور دین یا مذہب فرد کی ذاتی پسند ہے، اس کا اطلاق سیاست میں نہیں کیا جا سکتا۔ سیکولرزم دراصل اسی فکر کی پیداوار ہے جس کا آغاز عیسائی تھیوکریسی کی مخالفت میں ہوا تھا۔ تیسرا بڑا طبقہ وہ ہے جس کا ماننا ہے کہ دین اور سیاست کا آپس میں نہ صرف گہرا تعلق ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم اور ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اول الذکر دونوں طبقات افراط وتفریط کا شکار ہیں اور انہیں یہ غلط فہمی اسلام کو دوسرے مذاہب پر قیاس کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے، ورنہ اس حوالے سے قرآن وسنت اور عہد نبوی یا عہد صحابہ میں بہ کثرت مثالیں موجود ہیں۔ اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں متعدد ایسے انبیاء کرام کا ذکر کیا ہے جنہوں نے نبوت کی ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ سیاست کے فرائض بھی انجام دیے۔ ان میں حضرت داؤدؑ (ص:۲۶)، حضرت سلیمانؑ (النمل:۱۶-۱۷)، حضرت یوسفؑ (یوسف:۵۴-۵۶)، ذوالقرنینؑ (الکہف:۸۳-۸۶) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ عہد نبوی میں مسجد نبوی دین اور سیاست کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کی بہترین مثال ہے کہ آپؐ اکثر وبیشتر اسی جگہ سے سیاسی مسئلے مسائل حل کیا کرتے تھے۔ اسی طرح صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپؐ کی تدفین سے پہلے ہی خلیفہ کا انتخاب کر لیا تھا۔ ان حوالوں سے بہ خوبی یہ ثابت ہوتا ہے کہ دین کا سیاست سے گہرا تعلق ہے۔ اس کے برخلاف آراء پر مولانا صدرالدین اصلاحی (م ۱۹۹۸ء) نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''.....اس بحث کو ہم یہاں نظر انداز بھی کر سکتے تھے، اگر خود اسلام کے پیروؤں کی حد تک بھی یہ بحث بحث نہ بن گئی ہوتی۔ لیکن صورتِ واقعہ آج

یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کے صرف نام لیوا نہیں، بلکہ واقعی پیرو ہیں اور انہیں غیروں کی نہیں، بلکہ خود اپنی نگاہ سے دیکھنے کے مدعی ہیں، ان میں سے بھی بہتوں کا کہنا یہ کہ اسلام سے سیاست اور حکومت کا رشتہ زیادہ سے زیادہ ثانوی درجے کا ہے، دین میں اسے کوئی بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ نہ حکومت، اسلام کے لیے کوئی ناگزیر شئے ہے..... نہ اس کے قیام کے لیے کوشش کرنا اسلام کے پیروؤں کی کوئی دینی ذمہ داری ہے۔''[۱]

واقعہ یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات رکھتا ہے اور اس نے دنیا کے لیے جہاں ایک طرف معاشی، سماجی اور اخلاقی نظام پیش کیا ہے وہیں دوسری طرف ریاست اور حکومت کے میدان میں بھی رہ نمائی کی ہے۔ خود قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ان قوانین و احکام پر مشتمل ہے جن پر بغیر اسلامی حکومت کے عمل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نیز حضرت کعب الاحبارؒ کا ایک قول ہے:

مثل الاسلام و السلطان و الناس: مثل الفسطاط و العمود و الاوتاد. فالفسطاط الاسلام، و العمود السلطان، و الاوتاد الناس، و لا یصلح بعضها الا ببعض. [۲]

''اسلام اور حکومت اور عوام الناس، ان تینوں کی مثال شامیانے اور اس کے کھمبے اور اس کے کھونٹوں جیسی ہے۔ شامیانہ اسلام ہے۔ کھمبا حکومت ہے اور کھونٹے عوام الناس ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی باقی دو کے بغیر اپنی ٹھیک حالت میں نہیں رہ سکتا۔''

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۷۶۳ء) کی بھی یہی رائے تھی کہ اسلامی ریاست کا قیام ضروری ہے اور شریعت کی تکمیل اسی کے ذریعے ممکن ہوگی۔ وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

اعلم ان اتم الشرائع و اکمل النوامیس هو الشرع الذی یؤمر فیه بالجهاد. [۳]

''جان رکھو، سب سے مکمل شریعت اور سب سے کامل ہدایت الٰہی وہ شریعت ہوتی ہے جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہو۔''

واضح رہے کہ جہاد کا تصور بغیر اسلامی حکومت کے ممکن نہیں ہے۔ان دلائل کی روشنی میں یہ بخوبی کہا جاسکتا ہے کہ سیاست اسلام کا ایک اہم جزء ہے اور اسے اسلام سے الگ نہیں کیا جاسکتا، البتہ اسی کو کل اسلام سمجھ لینا بھی غلط ہے۔مولانا اشرف علی تھانوی (م۱۹۴۳ء) کی رائے بھی یہی ہے کہ حکومت کا قیام ضروری ہے، لیکن اسلام میں اس کا کیا شرعی مقام اور حدود ہیں اس پر وہ رقم طراز ہیں:

''اگر استطاعت ہو اور کسی بڑے مفسدے کا اندیشہ نہ ہو تو یہ جدوجہد واجب ہے، کبھی علی العین اور کبھی علی الکفایہ، لیکن اگر کسی بڑے مفسدے کا اندیشہ ہو یا استطاعت نہ ہو تو واجب نہیں، لیکن مختلف حالات میں جائز یا مستحب ہوسکتی ہے، اور اس کے تعین میں اہلِ علم کی آراء بھی مختلف ہوسکتی ہیں۔اور یہ اختلاف آراء اگر اخلاص کے ساتھ ہو تو نہ مذموم ہے نہ اس میں کسی کو دوسرے پر ملامت کرنے کا حق ہے۔''[۴]

دلچسپ بات یہ ہے کہ مشہور و معروف غیر مسلم محقق مالک رام (م۱۹۹۳ء) بھی اسلامی خلافت کے قائل نظر آتے ہیں اور انہوں نے اپنی تحریروں میں اسے اور اس کے بنیادی عناصر کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔وہ دلیل میں قرآن کریم کی آیت کریمہ (النور:۵۵) سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ وعدہ قومی سطح پر بھی ہے، اور شخصی پر بھی۔آخر الذکر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سے مراد یہ ہوگی کہ جب رسولؐ کی وفات ہوجائے گی تو خداوند تعالیٰ صالح العمل مومنوں میں سے کسی شخص کو خلیفہ مقرر کرے گا۔یہ اس کی پرانی سنت ہے، وہ اس سے پہلے انبیاء کی وفات کے بعد بھی خلیفہ مقرر کرتا رہا ہے۔خلیفہ اس لیے مقرر ہوتا ہے کہ پسندیدہ دین مضبوط رہے اور خلیفہ مقرر کرنے کی علت غائی یہ ہے کہ جس طرح لوگ رسول کی زندگی میں خدائے واحد کی پرستش کرتے رہے ہیں، وہ ان کی وفات کے بعد بھی بدستور اسی طرح کرتے رہیں۔''[۵]

موجودہ معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ اگر دنیا کے سامنے جمہوریت (Secularism)، سرمایہ داری (Capitalism)، اشتراکیت (Socialism)، فسطائیت (Fascism)، آزاد خیالی

(Liberalism) یا اسی قبیل کے دیگر سیاسی نظام پر بات کی جائے تو اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، لیکن اگر کسی نے اسلام کے سیاسی افکار و نظریات پر گفتگو کی تو اسے بالعموم متشدد اور انتہا پسند ہونے کا خطاب دے دیا جاتا ہے۔ بہرحال ذیل میں اس حوالے سے بعض اہم نکات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

تصورِ خلافت اور خلیفہ

عہد قدیم و جدید کے علماء اور مفکرین تصور خلافت پر مختلف رائے رکھتے ہیں، جیسے ابوالحسن علی بن محمد الماوردی (۹۷۲-۱۰۵۸) اور امام غزالی (۱۰۵۸-۱۱۱۱) خلیفہ کی جگہ 'امام' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور مؤخر الذکر خلافت کی جگہ 'امامت' کا لفظ اختیار کرتے ہیں۔ ابن خلدون (۱۳۳۲-۱۴۰۶) کے نزدیک خلیفہ اللہ کا نہیں بلکہ رسول کا نائب ہوتا ہے اور وہ خلافت کے بجائے 'امامت' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳-۱۷۶۲) کے نزدیک 'بین الاقوامی معاشرہ' کا نام خلافت ہے اور خلیفہ، خلیفۃ الرسول ہوتا ہے۔ سرسید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸) خلیفہ کو نہ ہی خلیفۃ اللہ اور نہ ہی خلیفۃ الرسول مانتے ہیں اور خلافت کو محض ایک دنیوی سلطنت کی ایک صورت تصور کرتے ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹) نے نظام حکومت کے لیے 'خلافت' کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے سربراہ کو 'خلیفۃ المسلمین' کا لقب دیا ہے۔ یہی رائے مولانا صدرالدین اصلاحی (۱۹۱۶-۱۹۹۸) کی بھی ہے۔[۶]

اسلامی حکومت کے خدوخال

اسلامی حکومت کا قیام کس طرح سے ہوگا؟ اس کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟ وہ وحدانی ہوگی یا آفاقی؟ یا اسی قبیل کے دیگر سوالات پر اسلام نے خاموشی اختیار کرتے ہوئے اسے علماء اور فقہائے وقت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے اور اس کے لیے باقاعدہ کوئی تفصیلی نقشہ یا لگا بندھا طریقہ متعین نہیں کیا ہے۔ اس نے اسلامی حکومت اور ریاست کے تعلق سے صرف بنیادی اصول و قواعد متعین کر دیے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے عطا کردہ یہ سیاسی احکام دائمی ہیں اور رہتی دنیا تک کے لیے ہیں، کیوں کہ اس کے بنیادی اصولوں میں جہاں ایک طرف اس قدر سختی ہے کہ اس میں کوئی بشر حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تبدیلی نہیں کر سکے وہیں دوسری طرف اس کے جزئیات میں اتنی وسعت

اور کشادگی رکھی گئی ہے کہ جدید سے جدید دور میں ان پر بحسن وخوبی عمل کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی سیاسی نظام کے بنیادی خدوخال میں خلیفہ، اس کا انتخاب اور مجلس شوریٰ وغیرہ کو اہم مقام حاصل ہے، لیکن ان کے علاوہ اس میں دو مزید بنیادی تصورات ایسے ہیں جو اسے دیگر سیاسی نظاموں سے نمایاں اور ممتاز بناتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہاں مختصراً ذکر کر دیا جائے:

(۱) اقتدارِ اعلیٰ اور حق حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہوگا جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ. [۷]

''حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے۔''

نیز قرآن کریم کی متعدد آیات (الاعراف:۵۴، آل عمران:۱۸۹، آل عمران:۲۶) اسی پر دلالت کرتی ہیں۔

(۲) انسان کو صرف اس کے نائب کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ. [۸]

''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔''

اس کا واضح مطلب ہوا کہ قانون سازی اور احکام وشریعت کا نفاذ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق ہوگا۔ کسی فرد یا ادارے کو اجازت نہیں ملے گی کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق قوانین بنائے یا اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے احکام میں کسی قسم کی تبدیلی کرے۔ یہی وہ فرق ہے جو اسے دیگر سیاسی نظاموں سے جدا کرتی ہے، کیوں کہ ان میں انسان ہی اقتدار اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوتا ہے اور وہ قوانین نہ صرف خود بناتا ہے بلکہ اس میں من مانی تبدیلی بھی کرتا رہتا ہے۔

خلیفہ کا انتخاب

خلیفۂ وقت کا انتخاب کیسے ہو؟ اور اس کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ اسلام نے اس کے لیے باقاعدہ

کوئی اصول مرتب نہیں کیے ہیں، بلکہ اسے ہر زمانے کے ارباب حل وعقد پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ وقت اور حالات کی روشنی میں متعین کر لیں۔ اس کا عملی نمونہ ہمیں دورِ خلافت میں ملتا ہے کہ چاروں خلفاء کا انتخاب الگ طریقہ سے ہوا ہے۔ قرآن وسنت نے صرف اس کی وضاحت کر دی ہے کہ ایک خلیفہ میں کیا صفات ہونی چاہیے۔[9] البتہ اس کا انتخاب کیسے ہو اس پر دونوں خاموش ہیں۔ فقہائے وقت نے اس حوالے سے اپنی کتابوں میں رہ نمائی کی ہے۔ یہاں صرف ایک اشکال کی وضاحت کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں کسی منصب کی خواہش رکھنے اور اس کے لیے کوشش کرنے سے منع کیا گیا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے:

لا تسأل الامارة فانک ان أوتيتها عن مسألة وكلت اليها، و ان أوتيتها من غير مسألة أعنت عليها.[10]

''امیر بننے کی طلب نہ کرو، کیوں کہ اگر تمہیں تمہاری طلب پر امارت دی گئی، تو تمہیں اسی کے حوالے کر دیا جائے گا (یعنی تمہیں اس کی ذمہ داریاں خود بھگتنی ہوگی) اور اگر یہ امارت تمہیں طلب کے بغیر دی گئی تو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) تمہاری مدد کی جائے گی۔''

موجودہ دور کے مروجہ انتخابی طریقہ کار میں تو پورا نظام ہی امیدواری پر مشتمل ہے۔ ایسی صورت حال میں کس طرح سے انتخاب کیا جائے گا؟ صحیح بات یہ ہے کہ جب ہمارا ذہن ترقی یافتہ قوموں کے نظام اور اس کے طریقہ کار سے متاثر ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس سے علیحدہ سوچنے اور کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا ہے اور اسی کی تقلید کرتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ماضی میں دوسری قومیں مسلمانوں کے عروج کی وجہ سے ان کے افکار ونظریات کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرتی تھیں، ورنہ اس کے متبادل طریقہ کار بھی موجود ہیں۔ مفتی محمد تقی عثمانی نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔[11] خلیفہ کا انتخاب جمہور مسلمانوں کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے اور صرف ارباب حل وعقد کے مشوروں سے بھی یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔

خلیفہ ایک ہوگا یا ایک سے زائد؟

امتِ مسلمہ میں بیک وقت ایک خلیفہ ہوگا یا ایک سے زائد؟ آیا مسلمان سیاسی طور پر ایک

حکومت کے تحت رہیں گے یا مختلف؟ مولانا صدرالدین اصلاحی اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ چوں کہ نظامِ خلافت کی ضرورت، اہمیت اور نوعیت دینی ہے اس لیے اسلامی آبادیوں کی حدیں خواہ کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہوں، سارے مسلمانوں کا امام اور خلیفہ ایک ہوگا اور مختلف خطوں میں الگ الگ حکومتیں قائم کر لینا صحیح نہ ہوگا۔ اسی پر سوائے چند ایک افراد کے پوری امت کا اتفاق ہے۔ انہوں نے اس کے حق میں دیگر علمائے کرام کی آراء کو بھی پیش کیا ہے۔ البتہ حکومتی نظام وحدانی اور وفاقی دونوں ہو سکتا ہے۔ اول ترجیح وحدانی نظام کو ہی دی جائے گی، ہاں بعض مصالح کے پیشِ نظر وفاقی طرز حکومت کو بھی اختیار کیا جا سکتا ہے کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے۔ البتہ مولانا محمد حنیف ندوی علامہ ابن خلدون کی اس میں رائے الگ ہے۔ ان کے نزدیک اگر فتوحات کا دائرہ پھیل جائے اور ایک شخص ہی تنہا کاروبار سلطنت کو سنبھال سکنے کی ذمہ داری قبول نہ کر سکے تو اس وقت دو یا دو سے زائد خلفاء کا تقرر جائز ہوگا۔[۱۲] یہی رائے مترادف الفاظ کے ساتھ علامہ عبدالقاہر بغدادی (م ۴۲۹ھ)[۱۳]، علامہ ماوردی[۱۴]، علامہ جوینی[۱۵]، علامہ قرطبی[۱۶] اور علامہ محمد عبدالعزیز فرہاری[۱۷] نے بھی اختیار کی ہے۔

عالم اسلام میں اس وقت پچاس سے زائد مسلم ممالک ہیں تو ایسے میں کیا یہ ممکن ہوگا کہ ان کا ایک خلیفہ ہو؟ اگر اس پر تمام سربراہانِ ممالک کا اتفاق ہو جائے تو یقیناً وحدانی حکومت قائم ہو سکتی ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو بہت ممکن ہے کہ خانہ جنگی ہو، اس سے بچنے کے لیے وفاقی حکومت کے قیام میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس کی مثال بھی موجود ہے۔

اسلام اور جمہوریت

موجودہ دور میں جمہوریت (لادینیت) کا جادو اس قدر سر چڑھ کر بول رہا ہے کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی اس سے متاثر ہو گئے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اسلام کے سیاسی اصول وقوانین کو اس کے مطابق ڈھال دیا جائے، جب کہ اسلام اور جمہوریت بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ علامہ یوسف القرضاوی اس فکر پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> واذا وجد واحد من الزعماء، يصلي و يصوم و يحج و يعتمر، وهو —مع هذا— يؤمن بالعلمانية سبيلاً للحكم، فمثل

هـذا ربـمـا وقـع نتيـجة لازدواج الشخصية، الذى أصيب به كثيـر من المسلمين،فغدت حياتهم متباينة متناقضة......ان هذه الـنـمـاذج ثـمـرـة لفترة "التجهيل" التى مر بها المسلمون، عـنـدما دخل عليهم الاستعمار الثقافى المصاحب للاستعمار العسـكـرى،والـذى استـمـر بـعد رحيلـه،والذى يعده اولو ألالباب أشد خطراً من الاستعمار العسكرى.[۱۸]

''اگر مسلمانوں کا کوئی لیڈر ایسا ہو جو نماز روزہ کا پابند ہو، حج وعمرہ کرتا ہو اور اس کے ساتھ ہی سیکولرزم کا بھی دم بھرتا ہو، یعنی حکومت وریاست کے امور میں لادینیت کا قائل ہو تو درحقیقت یہ صورت حال کسی لیڈر کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بہت سے مسلمان اس تضادفکری کا شکار ہیں اور ان کی تمام زندگی اسی تضاد پر قائم ہے....مسلمانوں کا یہ طرز حیات دراصل اس جاہلی دور کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں نے استعماری طاقتوں کے تحت گزارا۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے مسلح استعمار سے زیادہ ان کے فکری اور ثقافتی استعمار نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔''

*جمہوریت کے حاملین میں خالد محمد خالد، احمد فواد زکریا اور علی عبدالرازق نمایاں ہیں۔ مؤخر الذکر کی اس حوالے سے ایک مشہور کتاب '*الاسـلام و اصـول الـحـكـم بـحث فى الخلافة و الحكومة فى الاسلام*' ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:*

أن الخلافة ليست أصلاً من أصول الاسلام ،وانما هى مسألة دنيـوية وسيـاسية أكثـر مـنهـا دينية، و أن القرآن و السنة لم يـوردا مـا بين –من قريب أو بعيد– كيفية تنصيب الخليفة أو تـعيينـه، معتبراً أن الخلافة نكبة على الاسلام و المسلمين،و يـنبـوع شر فاسد، وراح يسرد من معطبات التاريخ ما يبرهن على هذا الراى الصادم.[۱۹]

''خلافت محض ایک دنیوی اور سیاسی یا زیادہ سے زیادہ ایک مذہبی مسئلہ ہے۔اسلام کی بنیادی باتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے،قرآن وحدیث میں بھی اس کی وضاحت وارد نہیں ہوئی کہ خلیفہ کی تقرری کیسے کی جائے اور اسے خلافت کے عہدے پر فائز کرنے کا کیا طریقہ کار ہو؟ نیز ان کا خیال ہے کہ خلافت اسلام اور مسلمانوں کا المیہ ہے اور فساد کی جڑ ہے چناں چہ دلیل میں وہ ایسے تاریخی حقائق پیش کرتے ہیں جو اس اشتعال انگیز رائے کی تائید کرتے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جمہوریت (لادینیت) دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان میں کسی بھی صورت سے سمجھوتا ہونا ناممکن ہے۔اسلام دنیا میں غالب رہنے کے لیے آیا ہے اور سیادت و قیادت اس کے مزاج کا اٹوٹ حصہ ہے کیوں کہ یہ اللہ کا دین ہے اور اس کا دین کبھی مغلوب نہیں ہوسکتا۔وقتی طور سے ممکن ہے کہ اس کے ماننے والوں کی اپنی کم زوریوں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے قوموں کے عروج وزوال کے اصولوں کی وجہ سے مسلمانوں کی جگہ دوسری قومیں برسر اقتدار رہیں جیسا کہ اس وقت ہے،لیکن یہ صورت حال دائمی نہیں ہوسکتی۔

جدید جمہوری نظام اور نظریۂ اسلام

جدید دور میں جمہوریت کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ حکومت تمام مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ یکساں سلوک کرے اور انہیں پوری مذہبی آزادی دے،خواہ اس کا مذہب کوئی بھی ہو،جیسا کہ ہندوستان میں اسی طرز کی جمہوری حکومت رائج ہے۔یہ فکر مغرب کے قدیم جمہوری/لادینی نظریہ سے بالکل مختلف ہے اور اس میں سماج کو مذہب سے دور نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اس میں مذہبی رواداری اور برداشت کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ کیا اسلام اسے قبول کرتا ہے یا نہیں؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔محمد فتح اللہ گولن (پ ۱۹۴۱ء) اس کے قائل نظر آتے ہیں البتہ وہ صرف دنیاوی امور میں جمہوری نظام کو قبول کرتے ہیں چناں چہ اسلام کا موازنہ جمہوریت سے کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اسلام کا موازنہ جمہوریت کے ساتھ کرتے ہوئے ہمیں یہ بات یاد رکھنی

چاہئے کہ جمہوریت ایک بتدریج فروغ پانے والا اصلاح پذیر نظام ہے۔جمہوریت کا اطلاق مقام اور حالات کی مناسبت سے مختلف الشکل ہے، دوسری طرف اسلام نے ایمان ویقین،عبادت اور اخلاقیات سے متعلق نا قابل تبدیل اصول وضع کر رکھے ہیں اس لیے اسلام کے دنیاوی امور سے متعلق پہلوؤں کی جمہوریت سے موازانہ کیا جائے۔''[۲۰]

علامہ یوسف القرضاوی بھی جدید جمہوری نظام کے قائل نظر آتے ہیں،البتہ اس میں سے بعض ایسے اصول وضوابط جو قرآن وسنت اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہیں،انہیں چھوڑ دینے کی تلقین کرتے ہیں۔انہوں نے الیکشن اور ووٹنگ کو''شہادت'' سے اور پارلیمنٹ کو''شوریٰ'' سے تعبیر کیا ہے۔وہ اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

''موجودہ جمہوریت کا بنیادی ڈھانچہ اسلامی نظام حکومت سے بہت مختلف نہیں ہے۔موجودہ جمہوریت میں بھی عوام میں سے چند لوگ منتخب ہو کر پارلیمنٹ میں جاتے ہیں۔سربراہِ مملکت پارلیمنٹ کے مشورے سے کارہائے حکومت انجام دیتا ہے۔عوام الناس کو اختلاف رائے کا حق حاصل ہوتا ہے.....حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے جمہوریت کے لیے بنیادی اصول پہلے ہی فراہم کر دیے تھے اور باقی رہیں اس کی تفصیلات اور جزئیات تو یہ لوگوں کے صواب دید پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے زمانے کی ضرورتوں اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق طے کرلیں۔''[۲۱]

حقیقت یہ ہے کہ اب خلفائے راشدین اور اس کے بعد کے ادوار جیسی خلافت کا انعقاد ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ اس وقت کی روشن تاریخ ہے جب مسلمان زندگی کے تمام شعبوں میں ثریا کی بلندیوں پر تھے اور ان کی حیثیت فاتح کی تھی۔دوسری قومیں ان کے سامنے کسی نہ کسی صورت میں سرنگوں تھیں اور ان کی امامت انہوں نے قبول کی تھی۔اب صورت حال بالکل ہی تبدیل ہو چکی ہے،اس وقت مسلمان کہیں بھی فاتح کی حیثیت نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ دینی،سائنسی اور اخلاقی علوم میں دوسری قوموں پر برتری رکھتے ہیں۔ایسے حالات میں دوسری قومیں جو اس سلسلے میں امت مسلمہ سے کہیں آگے ہیں وہ

ہمیشہ رکاوٹ ڈالیں گی۔مصر کے سابق صدر ڈاکٹر محمد مرسی عیسیٰ العیاط (م ۲۰۱۹ء) کا معزول ہونا اور ان کی شہادت اس کی واضح مثال ہے۔ہاں، اگر مستقبل میں مسلمانوں نے بہ حیثیت مجموعی خلفائے راشدین یا دیگر صحابہ کرام کی اتباع کی تو یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں زمین پر خلیفہ بنائے گا جیسا کہ قرآن کریم میں اس کا وعدہ ہے۔اس لیے موجودہ صورت حال میں راقم کی نظر میں بہتر یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا نظام ایسی بنیادوں پر ہو جس میں سب کو برابر اور یکساں حقوق حاصل ہوں، دوسری قوموں کو اپنے مذہب، عقائد اور رسم ورواج پر عمل کرنے کی آزادی ہو، البتہ اس میں کوئی دستور یا قانون ایسا نہ ہو جو قرآن وسنت کے برخلاف ہو۔اس کی تائید اسلامی تاریخ اور سیرت نگاری میں ایشیا کے صف اول کے سیرت نگار پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی کی رائے سے بھی ہوتی ہے۔راقم نے اس حوالے سے ان سے گفتگو کی جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

> ''اب عہد نبوی یا خلفائے راشدین جیسی اسلامی خلافت کا انعقاد ممکن نہیں ہے۔اسلام کا سیاسی نظام قیامت تک کے لیے ہے اور اس کی یہی خاصیت ہے کہ اس میں وقت اور حالات کے مطابق تبدیلی کی گنجائش رہتی ہے، البتہ اس کے بنیادی اصولوں میں ردوبدل نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ وہ من جانب اللہ ہیں۔موجودہ حالات میں مناسب یہ ہے کہ دنیا میں رائج وہ سیاسی نظام جو اسلام کے سیاسی نظام سے قریب تر ہیں، ان کے مضر پہلوؤں کو نکال کر کے اختیار کیا جائے۔اس سلسلے میں سوئزلینڈ اور کچھ حد تک فرانس کے سیاسی نظام کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔''[۲۲]

اسلامی ریاست میں عورتوں کی حیثیت

وقت کا ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ اسلامی ریاست میں عورت کی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا اسے خلیفہ بنایا جاسکتا ہے؟ کیا وہ ووٹ دے سکتی ہے؟ کیا وہ بہ حیثیت مشیر سیاسی مشوروں میں شریک ہوسکتی ہے؟ یا اسے کسی اہم عہدے پر فائز کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس نازک موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمارے ذہن میں ایک بنیادی نکتہ واضح ہونا چاہیے کہ اس میں ہمارا رویہ مدافعانہ نہ ہو اور نہ ہی معذرت

خواہانہ دلائل کے ذریعے ناقدین اور معترضین کو یہ پیغام دینا چاہیے کہ ہم خود ایمان کے ہاتھوں مجبور ہیں اور بس صفائی پیش کر رہے ہیں، بلکہ ہمیں اپنے موقف پر مضبوط دلائل کے ساتھ قائم رہنا چاہیے۔

عورت بہ حیثیت خلیفہ

تمام جمہور علماء اور فقہاء خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت کو خلیفہ کے منصب پر فائز نہیں کیا جا سکتا۔ امام ابن کثیر (تفسیر ابن کثیر: ۴۹۱/۱)، امام رازی (تفسیر کبیر: ۸۸/۱۰)، امام قرطبی (۱۶۸/۵)، علامہ سید محمود آلوسی (روح المعانی: ۲۳/۵) اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی (مظہری: ۲/ ۹۸) کی یہی رائے ہے۔ اس حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ مبارک بھی ہے:

لن يفلح قوم ولّوا امورهم امرأة. [۲۳]

''وہ قوم ہرگز فلاح کو نہیں پہنچے گی جس نے زمام حکومت عورت کے سپرد کر دی۔''

یہ حدیث صحیح بخاری، ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں درج ہے اور تمام فقہاء اور علماء نے اسے متواتر کے درجے میں رکھا ہے۔ خود عہد نبوی سے لے کر عہد عثمانی تک کوئی عورت خلیفہ نہیں بنائی گئی۔ نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا جب کہ ان کی برتری اور صلاحیت پر کسی کو شک نہیں تھا، اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ اسلام میں اس کی گنجائش ہی نہیں ہے ورنہ کم از کم ایک یا دو مثالیں ضرور مل جاتیں، حتیٰ کہ مسلمانوں کے دورِ عروج کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں بھی کسی عورت کو حاکم، قاضی اور وزیر وغیرہ کے عہدے پر فائز نہیں کیا گیا۔ بعض اہل علم حضرت عائشہؓ (۶۷۸ء)، ملکہ سبا (بلقیس) [۲۴]، شجرۃ الدر (م ۱۲۵۷ء) [۲۵]، رضیہ سلطانہ (م ۶۳۷ھ) [۲۶]، چاند بی بی (م ۱۵۹۹) [۲۷]، بھوپال کی بعض بیگمات [۲۸] اور محترمہ فاطمہ جناح (م ۱۹۶۷ء) [۲۹] کا ذکر کرتے ہوئے عورت کو بہ حیثیت خلیفہ جائز قرار دیتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اول الذکر نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا تھا اور معاملہ صرف حضرت عثمانؓ کے قصاص کا تھا۔ اس کی تائید حافظ ابن حجر عسقلانی کی تحریر سے بھی ہوتی ہے:

ان أحدا لم ينقل أن عائشة و من معها نازعوا عليا في الخلافة. [۳۰]

''بے شک کسی ایک سے یہ منقول نہیں کہ عائشہؓ اور ان کے ساتھیوں نے حضرت علیؓ سے ان کی خلافت کے بارے میں جھگڑا کیا تھا۔''

حضرت علیؓ نے بھی حضرت عائشہؓ کے اس عمل کو پسند نہیں فرمایا اور اس پر انہیں ٹوکا:

یا صاحبة الهودج قد امرک الله ان تقعدی فی بیتکم ثم خرجت تقاتلین؟

''اے ہودے والی! اللہ نے آپ کو گھر بیٹھنے کا حکم دیا تھا اور آپ لڑنے کے لیے نکل پڑیں؟''

اس وقت حضرت عائشہؓ باوجود ذہانت اور حاضر جوابی کے یہ نہیں کہہ سکیں کہ مجھے اللہ نے خلافت، سیاست اور جنگ وجدال میں حصہ لینے کا پورا حق دیا ہے، بلکہ بعد میں انہوں نے اپنے اس عمل پر ندامت ظاہر کی تھی۔ ثانی الذکر اسلام قبول کرنے سے پہلے تک ہی ملکہ رہی اور اسلام لانے کے بعد حضرت سلیمانؑ نے انہیں اس عہدے پر باقی رکھا تھا، اس کی کوئی ٹھوس روایت نہیں ملتی ہے نیز قرآن وحدیث اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ بعض اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت سلیمانؑ نے ان سے شادی کر لی تھی اور انہیں سابقہ عہدے پر باقی رکھا تھا۔ کچھ روایات کے مطابق حضرت سلیمانؑ نے ان کا نکاح ہمدان کے حکم راں تبعؔ سے کرا دیا تھا اور حکومت ان کے حوالے کر دی تھی۔[۳۱] امام قرطبیؒ نے اس حوالے سے لکھا ہے:

لم یرد فیه خبر صحیح لا فی انه تزوجها و لا فی انه زوجها.[۳۲]

''اس بارے میں کوئی صحیح روایت وارد نہیں ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے خود شادی کر لی تھی اور نہ یہ کہ کسی دوسرے سے شادی کرا دی تھی۔''

ظاہر ہے کہ یہ سب حکایات ہیں اور ان سے کسی مسئلہ میں استدلال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہی رائے مولانا اشرف علی تھانوی کی بھی ہے، وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے، پس بلقیس کے قصہ سے کوئی شبہ نہ کرے کیوں کہ اول تو یہ فعل مشرکین کا تھا دوسرے اگر

سلیمان علیہ السلام نے بھی اس کی بادشاہت کو جائز رکھا ہو تو شریعت محمدی میں اس کے خلاف حکم ہوتے ہوئے ان کا فعل بھی حجت نہیں۔''[۳۳]

رہی بات نوی صدی ہجری کے مصر کے بنی ایوب خاندان (۱۱۷۱-۱۲۶۰ء) کی ایک خاتون 'شجرۃ الدر' کے حکم راں ہونے کی تو جب ابوجعفر مستنصر باللہ نے امرائے وقت کے نام پیغام بھیجا:

أعلموا ان كان ما بقى عند كم فى مصر من الرجال من يصلح للسلطنة فنحن نرسل لكم من يصلح لها أما سمعتم فى الحديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال: لا أفلح قوم ولوا أمرهم أمراة و أنكر عليهم انكاراً عظيماً و هددهم و حضهم على الرجوع عن توليتها مصر. فلما بلغ شجرة الدر ذلك خلعت نفسها من السلطنة برضاها من غير اكراه. [۳۴]

''اگر آپ کے پاس مصر میں ایسے مرد نہیں ہیں جو بادشاہت کر سکیں تو آپ ہمیں باخبر کریں، ہم ایسے لوگوں کو بھیجیں گے جو اس کے اہل ہیں۔ کیا آپ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ ''وہ قوم کام یاب نہیں ہوگی جس نے اپنا حکم راں عورت کو بنالیا'' اور ان کی اس بات کو سخت ناپسند کیا، انہیں آگاہ کیا اور ان کو اس بات پر ابھارا کہ وہ ایک عورت کو والیٔ مصر بنانے سے باز رہیں، چناں چہ جب شجرۃ الدر کو اس بات کو علم ہوا تو وہ بہ خوشی اور بہ رضا و رغبت خود ہی حکم رانی سے مستعفی ہوگئیں۔''

جہاں تک رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی وغیرہ کی بات ہے تو وہ اسلامی حکومت کی نہیں بلکہ مسلم حکومت کی سربراہ رہیں وہ بھی قلیل مدت کے لیے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس خاندان میں کوئی ایسا لائق و فائز مرد نہیں تھا جو حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکے، نیز تاریخ یہ گواہی پیش کرنے سے قاصر ہے کہ علمائے وقت اس کی سربراہی پر راضی تھے اور انہوں نے حمایت کی تھی، نیز ان کے خلاف بغاوتیں بھی ہوئیں اور اسی میں قتل بھی کر دی گئیں۔ رہی بات محترمہ فاطمہ جناح کی تو کسی بھی عالم یا مفکر دین نے اسے سربراہ کی حیثیت سے قبول نہیں کیا تھا اور اکثریت نے مخالفت کی تھی۔ جن لوگوں نے اس

کی حمایت کی بھی تو اسے اضطراری اصول کے تحت رکھا تھا کیوں کہ صدر ایوب خاں کے سامنے اور کوئی دوسرا مضبوط امیدوار نہ تھا۔ مولانا مودودیؒ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:

> ''اس وقت ہمارے سامنے یہ مسئلہ محض اپنی اس سادہ صورت میں درپیش نہیں ہے کہ ایک عورت مسلمانوں کی امیر ہوسکتی ہے یا نہیں بلکہ ہم ایک خاص صورت حال سے دوچار ہیں جس میں ملک پر ایک جابرانہ اور ظالمانہ استبدادی نظام مسلط ہوگیا ہے جو ہمارے دین واخلاق، تمدن وتہذیب اور معیشت وسیاست کے لیے تباہ کن ہے۔ اس نظام کو پرامن آئینی طریقے سے بدل دینے کے لیے ہمیں انتخابات میں ایک خداداد موقع مل رہا ہے۔ ملک میں فاطمہ جناح کے سوا کوئی دوسری شخصیت ایسی موجود نہیں جس پر اہل ملک کی عظیم اکثریت مجتمع ہوسکے..... ان کے مقابلے میں کسی اور شخص کو کھڑا کرنا یا انتخابی مقابلے میں غیر جانب دار رہنا، دونوں یہ معنی رکھتے ہیں کہ ہم صدر ایوب کی کامیابی میں عملاً مددگار ہیں۔''[۳۵]

درج بالا دلائل سے بہ خوبی ثابت ہوجاتا ہے کہ عورت ملک کی سربراہ نہیں بن سکتی۔ اگر معاشرے میں بعض واقعات اس طرح کے پیش آ بھی جائیں تو وہ قرآن وسنت اور اجماع امت کے مقابلے میں حجت نہیں بن سکتے۔ مسلم معاشرے میں شراب اور سود وغیرہ بھی بدقسمتی سے عام ہوچکا ہے تو کیا اسے اب جائز اور حلال مان لیا جائے؟ نیز خلیفۂ وقت مسلمانوں کا امام ہوتا ہے اور بالعموم وہی پنج وقتہ نماز، جمعہ اور عیدین کی امامت کرتا ہے اور ان میں خطبہ دیتا ہے، جب کہ اسلام میں عورت مردوں کی امامت نہیں کرسکتی اور نہ ہی خطبہ دے سکتی ہے تو سوچنے والی بات یہ ہے کہ وہ کیوں کر خلیفہ کے عہدے پر فائز کی جاسکتی ہے؟

عورتوں کے بعض سیاسی حقوق

اگرچہ اسلام نے عورت کو ریاست کی سربراہی عطا نہیں کی، لیکن اسے بعض سیاسی حقوق جیسے سربراہ کے انتخاب، قانون سازی اور بعض دیگر ریاستی معاملوں میں رائے دہی کے حقوق ضرور عطا کیے ہیں۔ ان میں سے بعض اہم حسب ذیل ہیں:

رائے دہی کا حق

اللہ رب العزت نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی الیکشن میں ووٹ دینے اور خلیفۂ وقت کے انتخاب میں شریک ہونے کا حق دیا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَى أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئاً وَلَا يَسْرِقْنَ ..... وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ. [۳۶]

''اے نبیؐ، جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی.....اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی، تو ان سے بیعت لے لو۔''

واضح رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سربراہِ حکومت کی تھی اور ان سے بیعت لینا ایک طرح سے حلف لے کر انہیں اپنا سربراہ مان لینا تھا۔ آپؐ نے جس طرح مردوں سے بیعت لی اسی طرح عورتوں سے بھی بیعت لی، بس فرق صرف اتنا رہا کہ انہوں نے کسی غیر محرم کا ہاتھ کبھی نہیں چھوا۔ حضرت آیۃ اللہ سید علی خامنہ ای (پ ۱۹۳۹ء) درج بالا آیت کی تشریح میں کہتے ہیں:

''خواتین آتی تھیں اور آ کر پیغمبر اسلامؐ سے بیعت کرتی تھیں، آں حضرتؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ مرد ہی آئیں اور بیعت کریں اور ان کی تبعیت میں جو رائے بھی مردوں نے ظاہر کی اور قبول کیا ہو عورتیں بھی انہیں قبول کرنے پر مجبور ہوں، ایسا نہیں تھا، آں حضرتؐ نے کہا، عورتیں بھی بیعت کریں..... مالکیت اور دیگر سیاسی وسماجی مسائل کے سلسلہ میں بھی ایسا ہی ہے۔'' [۳۷]

خلفائے راشدین نے بھی سنت نبوی کو برقرار رکھتے ہوئے عورتوں کو رائے دہی کا حق دیا چناں چہ جب حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لیے چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی تو اسی میں سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے (جنہوں نے خود کو اس منصب سے بری کر لیا تھا) موجودہ اصطلاح میں

بہ حیثیت الیکشن کمشنر مدینہ اور گرد ونواح کے علاقوں میں لوگوں کی آراء جاننی چاہی اور پھر کثرت رائے سے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ نامزد کیا۔ اس پورے انتخابی عمل کی خاص بات یہ رہی کہ انہوں نے اس سلسلے میں عورتوں سے بھی مشورہ کیا۔ تاریخ اس سے پہلے ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔

قانون سازی میں حصہ لینے کا حق

عورتوں کو اسلام کے عطا کردہ سیاسی حقوق کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ قانون سازی میں بھی مشورہ دیا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ رات میں گشت کر رہے تھے کہ انھوں نے ایک ایسی عورت کے درد بھرے اشعار سنے جس کا شوہر جہاد کے لیے گیا ہوا تھا:

تطاول هذا اليل و ازور جانبه و ليس الى جنبى خليل الاعبه.

''رات کالی ہے اور لمبی ہوتی جاتی ہے اور میرے پہلو میں یار نہیں کہ جس سے میں خوش فعلی کروں۔''

حضرت عمرؓ نے جب یہ اشعار سنے تو انہیں بڑا قلق ہوا اور فرمایا کہ میں نے زنان عرب پر بڑا ظلم کیا۔ پھر وہ حضرت حفصہؓ کے پاس آئے اور پوچھا کہ ایک عورت کتنے دن مرد کے بنا رہ سکتی ہے۔ انہوں نے کہا چار مہینے۔ آپؓ سے اگلے دن سے ہی حکم نافذ کر دیا کہ کوئی سپاہی چار مہینے سے زیادہ گھر سے باہر نہ رہے۔[۳۸]

اسی طرح جب حضرت عمرؓ نے ایک مجلس میں حقِ مہر کی بالا حد متعین کرنی چاہی تو ایک بوڑھی عورت نے النساء:۲۰ کا حوالہ دے کر ٹوک دیا اور خلیفۂ وقت کو اپنی بات سے رجوع کرنا پڑا۔[۳۹] اس پورے عمل کو جدید دور میں پارلیمنٹ میں بل پیش کرنا، اس پر بحث ومباحثہ کرنا اور پھر بل واپس لینے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائک (پ ۱۹۶۵ء) نے اول الذکر کو جدید دور کے الیکشن میں حصہ لینے اور ووٹ دینے اور آخری الذکر دونوں واقعات کو قانون سازی میں حصہ لینے کے مترادف قرار دیا ہے۔[۴۰]

امان دہی کا حق

اسلام نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اسلامی ریاست میں کسی کو امان دینے کا حق دیا ہے

اور اسلامی تاریخ کے مختلف واقعات اس کے گواہ ہیں کہ اسے بہ شمول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیگر صحابہ کرام نے تسلیم کیا ہے جیسے آپؐ کی صاحب زادی حضرت زینبؓ نے اپنے شوہر ابوالعاص بن الربیع کو امان دی اور اسے آپؐ نے بھی برقرار رکھا۔[۴۱] یہ اتنی عام اور معروف بات تھی کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

ان كانت المرأة لتجير على المؤمنين فيجوز. [۴۲]

''اگر کوئی عورت (مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف بھی) کسی کو امان دے دے تو جائز ہے۔''

موجودہ دور میں عورتوں کو سیاسی حقوق دینے کا سہرا مغرب کے سر جاتا ہے جب کہ درج بالا مباحث سے بہ خوبی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے انہیں یہ حقوق آج سے چودہ سو سال پہلے ہی عطا کیے تھے اور اس میں سب سے اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حقوق بغیر کسی مطالبے کے دیے ہیں جب کہ اس کے برعکس مغربی خواتین کو اس کے لیے مردوں سے ایک طویل جنگ لڑنی پڑی ہے۔ نیز مغرب جو عورتوں کے حقوق کا علم بردار ہے اس نے بھی شاذ و نادر ہی عورتوں کی سربراہی قبول کی ہے اور اس میں بھی اس کی حیثیت ایک ربر اسٹمپ سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ امریکہ جو حقوق نسواں کا سب سے بڑا علم بردار بنتا ہے، اب تک اس نے کسی خاتون کو اپنا صدر منتخب نہیں کیا ہے، بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ اکثر ممالک میں عورتوں کو سیاست میں رائے دہی کا حق بیسویں صدی میں دیا گیا ہے۔ اس کی شروعات سب سے پہلے نیوزی لینڈ نے کی تھی جس نے ۱۸۹۳ء میں خواتین کو یہ حق دیا۔ ہندوستان میں عورتوں کو یہ حق ۱۹۵۰ء میں حاصل ہوا۔[۴۳]

عہدوں پر فائز ہونے کا حق

رہا سوال اس کا کہ عورت کو حکومت کے بعض عہدوں پر فائز کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں علمائے کرام اور مفکرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک طبقہ اس کے جواز کا قائل نظر نہیں آتا ہے، چناں چہ مولانا مودودی لکھتے ہیں:

''..... یہ دونوں نصوص اس باب میں قاطع ہیں کہ مملکت میں ذمہ داری کے مناصب (خواہ وہ صدارت ہو یا وزارت یا مجلس شوریٰ کی رکنیت یا مختلف

محکموں کی ادارت) عورتوں کے سپرد نہیں کیے جا سکتے۔ اس لیے کسی اسلامی ریاست کے دستور میں عورتوں کو یہ پوزیشن دینا یا اس کے لیے گنجائش رکھنا نصوصِ صریحہ کے خلاف ہے اور اطاعت خدا اور رسول کی پابندی قبول کرنے والی ریاست اس خلاف ورزی کی سرے سے مجاز ہی نہیں ہے۔''[۴۴]

علامہ محمد حسین طباطبائی (م ۱۹۸۱ء) کی بھی کچھ اسی طرح کی رائے ہے چناں چہ وہ ایک سوال ''مرد اور عورت کے مساوی ہونے کی کیفیت اور عورتوں کی سیاست میں مداخلت'' کے جواب میں رقم طراز ہیں:

''اجتماعی موضوعات میں سے صرف تین موضوعات میں عورت کو اسلام نے مداخلت کی اجازت نہیں دی ہے۔ حکومت، فیصلہ دینا اور جنگ، قتل کے معنی، میں نہ جنگ سے مربوط دیگر حصوں کے معنی میں.....اس نظریہ کے لیے بہترین گواہ وہ مشترک کوشش ہے جس سے مغربی دنیا نے مرد اور عورت کی مشترک تعلیم و تربیت میں استفادہ کیا ہے، لیکن اس کے باوجود آج تک معاشرہ کے ان تین شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ میں بھی عورتوں کی کوئی قابل توجہ تعداد کو پیش نہیں کر سکے ہیں عدلیہ، سیاست یا جنگی سرداروں کے نابغوں کی فہرست میں (نرسوں، رقاص، فلمی ستاروں، نقاشی اور موسیقی کے برخلاف) مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کا تناسب بہت ناچیز ہے، مساوی کی بات ہی نہیں۔''[۴۵]

علمائے کرام کا دوسرا طبقہ عورتوں کو ملکی عہدوں پر فائز کرنے کا قائل نظر آتا ہے۔ اس فکر کے بعض حاملین دلیل میں حضرت عمرؓ کا طرز عمل پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت الشفاء بنت عبداللہ العدویہ کو بازار کا نگراں مقرر کیا تھا، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مختلف علمائے کرام نے اس واقعہ کی صحت پر سوال اٹھائے ہیں۔ امام ابوبکر ابن العربی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

وقد روى أن عمرؓ قدم امراءة على حسبة السوق، و لم يصح، فلا تلتفتوا اليه، فانما هو من دسائس المبتدعة فى

الحدیث. [۴۶]

''یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک عورت کو بازار میں احتساب کی غرض سے متعین کیا،لیکن یہ صحیح نہیں۔اس کی طرف توجہ نہ کرو،یقیناً یہ تو بدعتی لوگوں کی جانب سے حدیث میں داخل کردہ جھوٹی باتوں میں سے ہے۔''

اگر یہ واقعہ صحیح بھی مان لیا جائے،جیسا کہ تاریخ کی بعض کتابوں میں اس کا ذکر ملتا ہے تو اس میں ''کبھی کبھی کوئی معاملہ ان کے سپرد کر دیتے تھے'' کے الفاظ ہیں۔'الاستیعاب' اور 'الاصابۃ' دونوں میں ہے:

وربما ولّاها شيئا من امر السوق. [۴۷]

''کبھی کبھار بازار کے کسی معاملے کو ان کے سپرد کر دیتے۔''

راقم کے خیال میں اگر ایسا ہوا بھی ہے تو یقیناً وہ ایسے معاملات رہے ہوں گے جن کا تعلق صرف خواتین سے ہوگا کیوں کہ اس کی نظیر دیگر خلفائے راشدین کے ادوار میں نہیں ملتی ہے۔ہاں اگر ایسا بازار ہو جہاں خرید وفروخت مکمل طور سے خواتین کے ہی ذریعے ہوتی ہو تو وہاں خواتین کو ہی بہ حیثیت محتسبہ مقرر کیا جائے گا اور وہاں مرد کا تقرر جائز نہ ہوگا۔

ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے اپنی کتاب میں ''سفارتی مناصب پر فائز ہونے کا حق'' کے تحت لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے دور خلافت میں ۲۸ھ میں حضرت ام کلثوم بنت علیؓ کو ملکہ روم کے دربار میں سفارتی مشن پر بھیجا۔دلیل میں انہوں نے امام طبری کی کتاب 'تاریخ الامم والملوک:۲/۶۰۱، کا ایک اقتباس نقل کیا ہے اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس طرح آپؓ نے سفارتی مناصب پر عورتوں کی تقرری کی نظیر قائم فرمائی۔ [۴۸]

راقم الحروف نے جب اس کی تحقیق کی تو یہ بات غلط ثابت ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت ام کلثوم بنت علیؓ نے ملکہ روم کو بعض تحائف بھیجے تھے،بذات خود وہ اس کے پاس تشریف نہیں لے گئیں تھیں۔امام طبری کے اصل الفاظ درج ذیل ہیں جس سے حقیقت واضح ہو جائے گی:

و بعثت أم كلثوم بنت علی بن أبی طالب الی ملكة الروم بطيب و مشارب وأحفاش النساء،ودسته الی البريد،فأبلغه لهـا،و أخذ منـه،وجـاء ت امرأة هرقل،و جمعت نساء

ھا،وقالت:ھذه ھدية امرأة ملك العرب،وبنت نبيھم......الخ.[۴۹]

علامہ یوسف القرضاوی نے عورتوں کے تمام سیاسی حقوق جیسے الیکشن لڑنے،ووٹ ڈالنے، پارلیمنٹ،اسمبلی یا کونسل کی ممبر بننے اوراسی طرح کی دیگر سرگرمیوں کو جائز قرار دیا ہےاور دلیل میں سورۃ التوبۃ:۷۱،آل عمران:۱۹۵،حضرت خدیجہؓ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینا،ہجرت میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی شریک ہونا،متعدد غزوات میں صحابیات کا شرکت کرنا،حضرت عائشہؓ کا حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد فوج لے کر نکلنا،حضرت عمرؓ کا حضرت شفاء بنت عبداللہ العدویہ کو بازار کا نگراں مقرر کرنا اور ملکہ سبا وغیرہ کا طرز عمل پیش کیا ہے۔[۵۰]ان میں سے بعض دلائل پر پہلے ہی گفتگو ہو چکی ہے۔اگرچہ علامہ موصوف اس حوالے سے عہد نبوی اور اس کے بعد کے ادوار سے مثالیں پیش کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں،لیکن ان کے بعض عقلی دلائل مضبوط ہیں اور وہ موجودہ حالات سے مناسبت رکھتے ہیں۔یقیناً ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

> ''اگر ہم اپنی عورتوں کو ووٹ دینے کے حق سے محروم کردیں گے تو مسلمانوں کا بہت سارا قیمتی ووٹ ضائع ہوجائے گا،جو اگر استعمال ہوتا تو شاید پارلیمنٹ میں کوئی اچھا مسلمان منتخب ہوکر جاتا اور مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا۔اسی طرح اگر ہم اپنی عورتوں کو الیکشن لڑنے اور پارلیمنٹ کی ممبر بننے سے روک دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں وہ عورتیں جائیں گی جنھیں دین اور مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور وہ عورتوں کے لیے ایسے قوانین نافذ کرنے کی کوشش کریں گی،جو اسلام کے خلاف ہیں۔کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ پارلیمنٹ میں ہمارے مرد اور ہماری عورتیں جائیں تاکہ وہ ہمارے مفاد کے لیے کام کرسکیں۔''[۵۱]

درج بالا مباحث سے واضح ہوتا ہے کہ عورت کو مختلف عہدوں پر فائز کرنے کے سلسلے میں علمائے کرام کی دو رائیں ہیں۔ایک اس کا مخالف تو دوسرا قائل نظر آتا ہے۔راقم الحروف کے نزدیک اس میں اعتدال کی راہ اختیار کرنا زیادہ مناسب ہوگا اور وہ یہ کہ موجودہ دور میں زیادہ تر ملکوں کا سیاسی نظام

کچھ ایسا ہے کہ اس میں کسی ایک کی حکم رانی نہیں ہوتی ہے اور پارلیمنٹ کے ذریعے قومی و بین الاقوامی معاملات طے کیے جاتے ہیں۔ایسے نظام میں عورت اگر شریعت کے مخصوص اصولوں کی پابندی کے ساتھ شریک ہو اور ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا تعاون دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔بعض مسلم ممالک جیسے ایران اور ترکی وغیرہ اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی صورت حال میں اگر کوئی غلطی ہوتی ہے تو حکومت کے دوسرے ارکان اس کی اصلاح کر سکتے ہیں،البتہ وہ ممالک جہاں پر کسی ایک کی مطلق العنان حکومت ہو تو وہاں عورت کی سربراہی مناسب نہیں ہوگی کیوں کہ پھر غلطیوں کا ازالہ ممکن نہ ہوگا۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ صدرالدین اصلاحی،اسلام ایک نظر میں،مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی)۲۰۱۶ء،ص:۱۹۰

۲۔ **الاندلسی،احمد بن محمد بن عبد ربہ،العقد الفرید،دار الکتب العلمیة، بیروت،لبنان،الطبعة الاولیٰ،۱۹۸۳ء،۱۰/۱-۱۱**

۳۔ **حجة الله البالغة:۲/۱۷۰**

۴۔ اشرف علی تھانوی،اسلام اور سیاست،**مجموعہ افادات،ادارہ تالیفات اشرفیہ** (ملتان)۱۴۲۷ھ، ص:۴۲-۴۳

۵۔ مالک رام،اسلامیات،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،جامعہ نگر (نئی دہلی)۱۹۸۴ء،ص:۳۶

۶۔ ملاحظہ ہو:بخاری،سید تنویر-جمیل،حمید اللہ،اسلام اور جدید افکار،ایور نیو بک پیلس،اردو بازار (لاہور) سن اشاعت غیر مذکورہ،ص:۳۳۰-۳۳۱

۷۔ یوسف:۴۰

۸۔ النور:۵۵

۹۔ النساء:۵۸،الحجرات:۱۳،البقرة:۱۲۴،البخاری:۴۴۲۵

۱۰۔ البخاری:۶۶۲۲

۱۱۔ ملاحظہ ہو:عثمانی،محمد تقی،اسلام اور سیاسی نظریات،مکتبہ معارف القرآن (کراچی)۲۰۱۰ء،ص:۲۰۳

۱۲۔ محمد حنیف ندوی،اساسیات اسلام،ادارہ ثقافت اسلامیہ،کلب روڈ (لاہور)۲۰۰۹ء،اشاعت سوم،ص:۱۹۶

۱۳۔ **أصول الدین،دار الکتب العلمیة،بیروت،لبنان**،۲۰۰۲ء،ص:۳۰۲۔علامہ کا پورا نام عبدالقاہر بن طاہر بن محمد بن عبداللہ البغدادی التمیمی تھا۔ان کی پیدائش بغداد میں ہوئی۔ان کا شمار اپنے دور کے بڑے محقق اور عالم دین میں ہوتا تھا۔انہیں تفسیر،فقہ اور علم الکلام پر خصوصی عبور حاصل تھا۔ان کی مشہور تصانیف میں **الناسخ و**

المنسوخ،تفسیر اسماء اللہ الحسنیٰ،تفسیر القرآن اور نفی خلق القرآن ہیں۔

۱۴۔ أدب الدنیا و الدین،دار اقرأ،بیروت ،اشاعت چہارم،۱۹۸۵ء،ص:۱۵۰-۱۵۱۔علامہ ماوردی کا پورا نام ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری تھا۔وہ 'الماوردی' کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے۔بصرہ میں ۳۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔فقہ اسلامی اور تفسیر سے خصوصی شغف تھا۔ان کا شمار شوافع کے مشہور علما میں ہوتا ہے۔مشہور تصانیف میں الأحکام السلطانیة، قانون الوزارة اور سیاسة الملک وغیرہ ہیں۔ان کا انتقال ۴۵۰ھ میں ہوا۔

۱۵۔ الارشاد الی قواطع الأدلة اصول الاعتقاد، مکتبة الثقافیة الدینیة، القاهرة .۲۰۰۹ء، ص:۳۲۶-۳۲۷۔علامہ جوینی کا پورا نام عبدالملک بن عبداللہ بن یوسف بن محمد تھا۔ان کی کنیت 'ابوالمعالی'، لقب 'جوینی' اور خطاب 'امام الحرمین' تھا۔وہ ۴۱۹ھ میں جُوین،خراسان میں پیدا ہوئے۔انھیں علم قرآن،علم فقہ، علم کلام،علم اصول اور علم تصوف پر عبور تھا۔علامہ کی مشہور کتاب میں البرهان فی اصول الفقه، الرسالة النظامیة،الورقات فی أصول الفقه وغیرہ ہیں۔ان کا انتقال ۴۷۸ھ میں ہوا۔

۱۶۔ الجامعن لأحکام القرآن و المبین لما تضمنه من السنة و آي الفرقان (تفسیر قرطبی)،مؤسسة الرسالة بیروت– لبنان، ۲۰۰۶ء،البقرۃ:۳۰،جلد اول،صفحات ۴۰۸-۴۰۹،علامہ قرطبی کا نام محمد بن احمد بن ابی بکر القرطبی تھا۔وہ قرطبہ میں ۶۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ان کا شمار اپنے دور کے بڑے عالم،فقیہ اور مفسرین میں ہوتا ہے۔ان کی مشہور کتابوں میں الاعلام فی دین النصاریٰ من الاوهام، التذکار فی أفضل الاذکار وغیرہ ہیں۔ان کی وفات:۶۷۱ھ میں ہوئی۔

۱۷۔ النبراس،شرح،شرح العقائد، تفصیلات غیر مذکورہ،ص:۳۳۱۔اس میں دونوں طرح کی رائے ہیں ۔خلفائے راشدین اور بعد کے خلفاء کا بھی یہی عمل رہا ہے۔

۱۸۔ یوسف القرضاوی،الاسلام و العلمانیة وجها لوجه ،مکتبة وهبة،القاهرة،الطبعة السابعة،۱۹۹۷ء،ص:۱۸۵

۱۹۔ علی عبدالرازق،الاسلام و اصول الحکم بحث فی الخلافة و الحکومة فی الاسلام،دار الکتاب المصری،القاهرة، ۲۰۱۲ء،ص:۸

۲۰۔ https://fgulen.com/ur/life-pk/selected-articles/31142-Comparative-study-of-Islam-and-Democracy

۲۱۔ علامہ یوسف القرضاوی،فتاویٰ یوسف القرضاوی ،مترجم:سید زاہد اصغر فلاحی،مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی)۲۰۱۰ء،جلد دوم،ص:۲۴۸

۲۲۔ ان خیالات کا اظہار استاد محترم پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی نے راقم سے ایک انٹرویو میں کیا تھا۔۱/۴/۲۰۲۰ء

۲۳۔ البخاری۔اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب اہلِ فارس نے کسریٰ کی بیٹی (پوران دخت بنت شیرویہ بن کسریٰ بن پرویز) کو اپنی حکومت کا سربراہ بنایا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات ارشاد فرمائے تھے۔

۲۴۔ سبا جنوبی عرب کی ایک مشہور تجارتی قوم تھی۔اس کا زمانہ ۹۵۰ق م سے ۱۱۵ق م تک رہا۔اس کا دارالحکومت

مارب،موجودہ یمن کی راجدھانی صنعاء سے پچپن (۵۵) میل شمال مشرق واقع تھا۔آخری دور میں اس حکومت کے فرماں روا 'ملک سبا' کہلانے لگے۔اسی بنیاد پر 'بلقیس' ملکہ سبا کے نام سے مشہور ہوئی،یعنی سبا کسی شہر یا کسی فرد کا نام نہیں بلکہ ملک یا قوم کا نام ہے۔ملاحظہ ہو: Hitti, P.K, History of the Arabs, Macmillan and Co., Limited St. Martin's Street, London, Third Edition, 1946, p.p 49-66

۲۵۔ **شجرة الدر مصر** کے سلطان صالح نجم الدین ابوالفتوح ایوب کی ترک لونڈی تھیں جن کو انہوں نے 'الکرک' سے ۱۲۳۹ء میں خریدا تھا۔ساتویں صلیبی جنگ میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔آخر میں انہوں نے عزالدین ایبک ترکمانی سے شادی کر لی اور اسّی (۸۰) دن حکومت کر کے اس کے حق میں دست بردار ہوگئیں۔

۲۶۔ رضیہ سلطانہ دہلی سلطنت کے حکمران شمس الدین التمش کی بہت ہی لائق وفائق بیٹی تھی۔۶۳۴ھ میں تخت نشین ہوئی اور اس نے تین سال چھ دن حکومت کی۔ملاحظہ ہو: فرشتہ،محمد قاسم،تاریخ فرشتہ،مترجم: عبدالحئی خواجہ،المیز ان ناشران وتاجران کتب،لاہور،۲۰۰۸ء،جلد اول،ص:۱۷۵

۲۷۔ چاند بی بی ۱۵۵۰ء کو احمد نگر میں پیدا ہوئی۔والد کا نام حسین نظام شاہ تھا۔مغلیہ سلطنت کی فوج کو انہوں نے کئی بار شکست دی،آخر میں اپنوں کی غداری سے قتل کر دی گئیں۔ملاحظہ ہو: تاریخ فرشتہ،جلد دوم،ص:۵۳۲

۲۸۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ نذر محمد خاں نے ۱۸۱۶ء میں انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا تھا جس میں طے پایا تھا کہ بھوپال کی ریاست اس کے بعد اس کی اولادوں میں محفوظ رہے گی اور بدلے میں ریاست کی فوج انگریزوں کی مدد کرے گی۔اسی کے نتیجے میں ۱۸۲۰ء میں نذر محمد کی نابالغ بیٹی سکندر بیگم کو ریاست کا والی بنایا گیا اور قدسیہ بیگم کو نگراں کے طور پر مقرر کیا گیا۔۱۸۴۵ء میں ثانی الذکر باقاعدہ والی ریاست بن گئیں۔اسی کے بعد سے بھوپال کی شہزادیاں والی ریاست ہوئیں۔

۲۹۔ فاطمہ جناح ۱۸۹۳ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔وہ قائداعظم محمد علی جناح کی بہن تھیں۔مسلم لیگ کی انہوں نے کامیابی کے ساتھ قیادت کی اور اپنی بے لوث سماجی وسیاسی خدمات کی وجہ سے 'مادر ملت' کا خطاب پایا۔بدقسمتی سے ۱۹۶۷ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ان کی تقاریر اور خطابات کا مجموعہ 'گلبانگ حیات' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

۳۰۔ فتح الباری:۵۶/۲

۳۱۔ ملاحظہ ہو: **الکلامل لابن الاثیر : ۲۳۸–۲۳۷/۱ ،البدایة و النهایة لابن کثیر :۲۴/۲**

۳۲۔ **قرطبی الجامع لاحکام القرآن:۲۱۰/۱۳–۲۱۱**

۳۳۔ اشرف علی تھانوی،بیان القرآن،ادارہ تالیفات اشرفیہ،چوک فوارہ (ملتان) ۱۴۲۷ھ،ص:۷۹۰

۳۴۔ **کحالة،عمر رضا،اعلام النساء فی عالم العرب و الاسلام،مؤسسة الرسالة،بیروت،سن اشاعت غیر مطبوعة،۲۸۸/۲**

۳۵۔ بحوالہ: فضل الرحمٰن بن محمد،اسلام میں عورت کی سربراہی کا کوئی تصور نہیں،انجمن اہل حدیث مسجد مبارک (لاہور) ۱۹۹۰ء،ص:۵۸

۳۶۔ الممتحنہ:۱۲

۳۷۔ یہ باتیں علامہ سید علی خامنہ ای نے ۲۰ ستمبر ۲۰۰۰ء کو خواتین کے ایک بڑے مجمع سے خطاب کے دوران کہیں تھیں، ملاحظہ ہو: علیخانی لق پور، کلامِ رہنما (حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کے بیانات کا مجموعہ)، ایران کلچر ہاؤس، ۱۸-تلک مارگ (نئی دہلی) باراول، ۲۰۱۵ء، ص:۲۴

۳۸۔ علامہ شبلی نعمانی، الفاروق، دارالاشاعت، اردو بازار (کراچی) ۱۹۹ء، ص:۳۲۴

۳۹۔ اس واقعہ کو ابی بکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی نے اپنی کتاب 'المصنف' میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے: **قال عمر بن الخطاب: لاتغالوافی مهور النساء، فقالت امرأة: ليس ذلک لک يا عمر، ان الله يقول: ﴿وان آتيتم احداهن قنطاراً من ذهب﴾ قال: و كذلک هی فی قراءة عبدالله ﴿فلا يحل لكم ان تاخذوا منه شيئا﴾ فقال عمر: ان امرأة خاصمت عمر فخصمته. الصنعانی، عبدالرزاق، المصنف، المكتب الاسلامی، بيروت، الطبعة الثانية ۱۹۸۳ء، الجزء السادس، ص۱۸۰، رقم:۱۰۴۲۰۔**

۴۰۔ ملاحظہ ہو: ذاکر نائیک، اسلام میں خواتین کے حقوق جدید یا فرسودہ؟، دارالنوادر (لاہور) ۲۰۰۶ء، ث:۴۹-۵۰

۴۱۔ ابن ہشام، **السيرة النبوية**:۱/۶۵۷

۴۲۔ سنن ابوداؤد:۳/۸۴، رقم:۲۷۶۴

۴۳۔ کس ملک نے کب عورتوں کو رائے دہی کا حق دیا، اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

Women in Politics: 1945-2005, Inter-Parliamentary Union, Chemin Du Pommier 5, 1218 Le Grand-Saconnex/ Geneva, Switzerland, 1889, p.p 01-07

۴۴۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست: فلسفہ، نظام کار اور اصولِ حکمرانی، اسلامی پبلیکیشنز لمیٹڈ (لاہور) اشاعت ۲۰، ۲۰۰۰ء، ص:۴۰۲

۴۵۔ علامہ محمد حسین طباطبائی، اسلام اور آج کا انسان، ولایت فاؤنڈیشن (نئی دہلی) باردوم، ۲۰۱۵ء، ص:۱۴۸

۴۶۔ **أحكام القرآن**:۳/۱۴۵۷

۴۷۔ **الاستيعاب فی معرفة الأصحاب**:۴/۱۸۶۹، **الاصابة فی تمييز الصحابة**:۸/۱۲۱

۴۸۔ محمد طاہر القادری، اسلام میں انسانی حقوق، منہاج القرآن، پبلی کیشنز (لاہور) ۲۰۰۴ء، ص:۴۶۰-۴۶۱

۴۹۔ **الطبری، أبی جعفر محمد بن جرير، تاريخ الطبری تاريخ الرسل والملوک، دار المعارف بمصر، القاهرة، الطبعة الثانية، بدون سنة، الجزء الرابع. ص:۲۶۰**

۵۰۔ ملاحظہ ہو: علامہ یوسف القرضاوی، **فتاویٰ یوسف القرضاوی**، مترجم: سید زاہد اصغر فلاحی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی) ۲۰۱۰ء، جلد دوم، ص:۱۵۳-۱۶۳

۵۱۔ **فتاویٰ یوسف القرضاوی**، جلد دوم، ص:۱۵۹

ندیم سحر عنبرین*

اسلام میں حقوقِ اطفال

بچے قوم کے مستقبل ہوتے ہیں، اس بات سے عقل وشعور رکھنے والا کوئی بھی انسان انکار نہیں کرسکتا، اس لیے ضروری ہے کہ ملک وقوم کے اس قیمتی اثاثہ کی اچھی طرح نگہ داشت کی جائے تاکہ یہ ایک کارآمد سرمایہ ثابت ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ان معصوم بچوں کا بچپن ان تمام نفسیاتی، سماجی اور جسمانی بدسلوکیوں سے پاک ہو جن سے موجودہ دور کے کروڑوں بچے دوچار ہیں۔ سیاسی اور نظریاتی جھگڑوں کی وجہ سے پوری دینا میں جنگ وجدال کا ماحول برپا ہے اور اس جنگ وقتال کی وجہ سے سماج کا ایک رکن جو سب سے زیادہ متاثر ہے وہ بچوں کا طبقہ ہے۔ امن اور اچھی زندگی کی تلاش نے قوموں کو نقل مکانی پر مجبور کردیا اور نقل مکانی نے بچوں کے ذہنوں پر وہ منفی اثرات ڈالے ہیں جن کی وجہ سے بچے نفسیاتی مریض ہوگئے ہیں۔ بچوں کی بہت بڑی تعداد روزمرہ کی زندگی گزارنے کے لیے بہت کم عمری میں کام کرنے پر مجبور ہوگئی ہے، ان کا بچپن کھیل کود، پڑھنے لکھنے اور ہنسی مذاق کے بجائے نان شبینہ کے لیے کارخانوں کی مشینوں، چائے کی دکانوں، سڑک کنارے تماشہ دکھانے اور کوڑے کے ڈھیر کی نظر ہوگیا ہے۔ اچھی تعلیم کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

* گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ای میل: nadeember90@gmail.com

مذہب اسلام نے اپنے ماننے والوں کو کسی بھی موڑ پر بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔ قرآن و سنت میں اس کے لیے ہدایت کا سامان موجود ہے۔ ایک بچے کی پیدائش سے لے کر بالغ ہونے تک اور بالغ ہونے سے نوجوانی اور نوجوانی سے بڑھاپے کی طرف سفر اور پھر ملأ اعلیٰ کی طرف آخری سفر تک کے تمام ہدایات اس شریعت میں موجود ہیں۔ یعنی یہ شریعت مہد سے لحد تک ہر جگہ انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے بچوں کے حقوق کی اس وقت وکالت کی جب Human Rights Commision کی نہ بنیاد پڑی تھی اور نہ ہی ان جیسی کمیشن کا کوئی تصور تھا۔ زندگی جینے کے حقوق پر زور دیتے ہوئے اللہ رب العزت قرآن میں ارشاد فرماتا ہے:

وَلاَ تَقْتُلُواْ أَوْلاَدَكُم مِّنْ إِمْلاَقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ.[1]

اور تم اپنی اولادوں کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

اللہ اور اس کے رسول نے بیٹیوں کے درگور کرنے جیسی رسم کی مذمت کی۔ اللہ کے رسول نے خاص طور سے لڑکیوں کی کفالت پر زور دیا اور کہا کہ اگر کوئی انسان اپنی دو بیٹیوں کی صحیح سے پرورش کرے، جنت میں وہ میرے ساتھ ہوگا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے، یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت میں میرا اس کا ساتھ (انگلیوں کو ملا کر فرمایا) اس طرح ہوگا۔"[2]

ایک اور روایت ہے:

جو شخص لڑکیوں کی پیدائش میں مبتلا کیا گیا اور اس نے ان کی پوری پرورش و پرداخت کی تو وہ لڑکیاں اس کے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔[3]

مذہب اسلام بچوں سے متعلق جن جن حقوق کی ضمانت دیتا ہے اگر اس پر تفصیل سے لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ شریعت اسلامیہ میں بچوں کے حقوق اس وقت سے ہی شروع ہو جاتے ہیں جب وہ اپنے ماں کے پیٹ میں تخلیق کے مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں اور جنین ہوتے

ہیں۔ولادت سے پہلے اسلام بچوں کو جو حقوق عطا کرتا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔زندگی کا حق

۲۔وراثت کا حق

۳۔وصیت کا حق

۴۔وقف کا حق

۵۔تاخیرِ اقامتِ حد کا حق

جنین کے لیے مذکورہ بالا تین حقوق کے علاوہ بھی کچھ حقوق ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ حاملہ عورت پر وضعِ حمل تک حد قائم کی جائے گی نہ اس سے قصاص لیا جائے گا۔رسول اللہؐ کے دور میں ایسے واقعات پیش آئے جن میں رسول اللہؐ نے اس وقت تک حد قائم نہ کی جب تک بچہ کھانے اور پینے کے لائق نہیں ہوگیا۔حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

''قبیلہ جہینہ کی ایک عورت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور وہ بدکاری سے حاملہ تھی۔اس نے عرض کیا: اے اللہ کے نبیؐ! میں نے حد لاگو ہونے والا فعل کیا ہے پس مجھ پر حد لگائیے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سرپرست کو بلایا اور فرمایا: اِسے اَحسن طریقے سے رکھو (بدکاری کا گناہ کرنے کے باوجود اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو کیونکہ اس نے اپنے گناہ کا اِقرار کرلیا ہے اور اس پر شرمسار ہے)، جب وہ بچہ جن لے تو اسے میرے پاس لے آنا۔اس نے ایسا ہی کیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کے متعلق حکم دیا تو اس کے کپڑے مضبوطی سے باندھ دیے گئے (تاکہ ستر نہ کھلے)، پھر حکم دیا تو اسے سنگسار کیا گیا۔پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نمازِ (جنازہ) پڑھی۔اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا نبیؐ! آپ اس پر نماز پڑھتے ہیں حالانکہ اس نے زنا کیا تھا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس نے توبہ بھی تو ایسی کی ہے کہ اگر

اسے مدینہ کے ستر آدمیوں پر تقسیم کیا جائے تو سب کے لیے کافی ہو اور کیا تم نے اس سے بہتر توبہ دیکھی ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی جان دے دی۔''[۴]

اسی طرح کی ایک اور روایت ہمیں قبیلہ غامد کی ایک عورت کی ملتی ہے، حضرت عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں:

قبیلہ غامد کی ایک عورت (بارگاہِ رسالتصلی اللہ علیہ وسلم میں) حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے بدکاری کی ہے، مجھے پاک کر دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے واپس بھیج دیا۔ جب دوسرا دن ہوا تو اس نے کہا: یارسول اللہؐ! آپ مجھے کیوں لوٹاتے ہیں، شاید آپ ایسے ہی لوٹانا چاہتے ہیں جیسے ماعز (بن مالک) کو لوٹایا تھا۔ خدا کی قسم! میں تو حاملہ ہوں (پس اب میرے بدکار ہونے میں کیا شک ہے)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا اگر تو نہیں لوٹنا چاہتی تو جا اور وضعِ حمل کے بعد آنا۔ پس جب اس نے بچہ جن لیا تو وہ اسے ایک کپڑے میں لپیٹ کر لے آئی اور عرض کرنے لگی: یہ وہ بچہ ہے جسے میں نے جنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جا اور اسے دودھ پلا یہاں تک کہ تو اسے دودھ چھڑا دے۔ جب اس نے بچہ کا دودھ چھڑا لیا تو بچہ کو لے کر آئی کہ اس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا ہے اور یہ کھانا کھانے لگا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بچہ ایک مسلمان کو پرورش کے لیے دے دیا۔ پھر حکم دیا تو اس عورت کے لیے اس کے سینے تک ایک گڑھا کھودا گیا، پھر لوگوں کو اسے سنگ سار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایک پتھر لے کر آئے اور اس کے سر پر مارا تو خون کے چھینٹے حضرت خالد رضی اللہ عنہ

کے چہرے پر پڑے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اسے برا کہا تو یہ برا کہنا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار اے خالد! (ایسا مت کہو) قسم خدا کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! اس نے تو ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ناجائز محصول لینے والا (جو لوگوں پر ظلم کرتا ہے اور حقوق العباد میں گرفتار ہوتا ہے اور مسکینوں کو ستاتا ہے) ایسی توبہ کرے تو اس کا گناہ بھی بخش دیا جائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تو اس پر نماز پڑھی گئی اور وہ دفن کی گئی۔'' [۵]

زندگی کا حق

اللہ رب العزت نے انسانوں کو زندگی بخشی اور وہی انسانوں کا خالق، مالک اور رب ہے۔ بلاوجہ انسانوں کے قتل کو اللہ نے حرام ٹھرایا ہے اور اسے فساد سے تعبیر کیا ہے۔ اسلام کی آمد سے پہلے عربوں میں اولاد کے پیدا ہوتے ہی اسے مار ڈالنے جیسی قبیح رسم موجود تھی۔ اس قبیح رسم میں ملوث لوگوں کو اللہ نے پھٹکار لگائی اور فرمایا:

> یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ کے دئے ہوئے رزق کو اللہ پر افترا پردازی کر کے حرام ٹھہرالیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے۔ [۶]

بعض لوگ بھوک اور افلاس کے خدشہ سے اولاد کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ قتل کی ممانعت کرتے ہوئے قرآن حکیم میں اللہ رب العزت فرماتا ہے:

> **وَلاَ تَقْتُلُواْ أَوْلاَدَكُم مِّنْ إمْلاَقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ.**
>
> اور مفلسی کے باعث اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ہم ہی تمہیں رزق دیتے ہیں اور انھیں بھی دیں گے۔'' [۷]

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْا أَوْلَادَهُمْ سَفَهاً بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَاءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْن.

اورتم اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل مت کرو، ہم ہی انھیں (بھی) روزی دیتے ہیں اور تمہیں بھی، بے شک ان کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔[۸]

رسول اللہ نے شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ قتل کو قرار دیا ہے۔ بخاری کی روایت ہے:

حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسولؐ سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرو جبکہ اسی نے تمھیں پیدا کیا ہے، حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اس کے بعد کون سا گناہ ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے قتل کردو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔[۹]

اِسلام سے قبل عربوں کے بعض قبائل میں بیٹیوں کی پیدائش کو نہایت برا سمجھا جاتا تھا اور انھیں زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ اِسلام نے اس خیالِ باطل کا ردّ کیا اور بیٹیوں کی پیدائش کو باعث رحمت قرار دیا۔ قرآن حکیم ایک مقام پر روزِ محشر کی سختیاں اور مصائب کے بیان کے باب میں فرماتا ہے:

وَإِذَا الْمَوْؤُدَةُ سُئِلَتْ. بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَت.[۱۰]

اور جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے باعث قتل کی گئی تھی۔

مشہور شاعر الطاف حسین حالی عربوں کی اس جہالت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر
تو خوف شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور

کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گود اپنی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

زمانہ جاہلیت میں لڑکیوں کی پیدائش کے واقعات اس قدر دل دہلا دینے والے ہیں کی آج کے دور میں ہم اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔عربوں نے ایک دو نہیں اپنی آٹھ آٹھ بچیوں کو زندہ درگور کر دیا۔قتادہ روایت کرتے ہیں:

قیس بن عاصم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ میں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں زمانہ جاہلیت میں، آپ نے فرمایا ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک اونٹ قربانی کرو۔[11]

آج کے موجودہ دور میں یہ قبیح رسم پھر سے رائج ہوگئی ہے، Female Foeticide کے واقعات بہت عام ہوگئے ہیں۔دور جاہلیت میں جس طرح عرب کے بعض قبائل لڑکیوں کی پیدائش کو برا جانتے تھے، ٹھیک اسی طرح آج کا متمدن دور لڑکیوں کی پیدائش کو برا جان رہا ہے۔جہیز، مفلسی اور سماج میں لڑکیوں کے ساتھ جنسی بدسلوکیوں کے ڈر سے اس ننھی سی جان کو لوگ موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔اکثر و بیشتر اخباروں اور سوشل میڈیا پر ہم ایسی خبریں دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں جن میں معصوم لڑکیوں اور بچیوں کو اپنی حوس کا شکار بنایا گیا ہوتا ہے۔جہیز کی خاطر لڑکیوں کو جلا کر یا زہر دے کر مار دیا جاتا ہے۔ان سے اس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے کہ دنیا میں اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے، وہ صرف اور صرف مرد کی ضروریات پوری کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

اچھے نام رکھنے کا حق

نام بچوں کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس لیے بچوں کے نام اچھے اور بامعنی ہونے چاہیے۔ہم اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ لوگ بامعنی نام کے بجائے ایسے نام رکھنا پسند کرتے ہیں جو سننے میں اچھے معلوم ہوں چاہے ان ناموں کا کوئی صحیح معنی موجود نہ ہو۔ایسے نام نہیں رکھنے چاہیے جن سے کسی طرح کی شرک کی بو آئے۔ہمیں اسلامی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں

کہ رسول اللہ نے بعض صحابہ کرام کے نام بدل دیئے تھے۔ مثلاً ابو بکرؓ کا نام عبدالکعبہ سے بدل کر عبداللہؓ رکھ دیا تھا۔ مذہب اسلام نے نام کے انتخاب کا حق باپ کو دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک رویت مروی ہے:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ والد کا بچے پر یہ حق کہ بچے کا بامعنی اور بہتر نام رکھے اور اس کی اچھی تربیت کرے۔[۱۲]

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> روزِ قیامت تم اپنے ناموں اور اپنے آباء کے ناموں سے پکارے جاؤ گے اس لیے اپنے نام اچھے رکھا کرو۔[۱۳]

حضرت ابو وہب جشمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> **"تسمّوا باسماء الانبیاء واحب الاسماء الی اللّٰہ عبد اللّٰہ و عبد الرحمٰن و اصدقھا حارث وھمام و اقبحھا حرب ومُرة."**[۱۴]
>
> انبیائے کرام کے ناموں پر اپنے نام رکھا کرو اور اللہ تعالیٰ کو تمام ناموں میں 'عبداللہ' اور 'عبدالرحمٰن' زیادہ پسند ہیں۔ سب ناموں سے سچے نام 'حارث' اور 'ہمام' ہیں جب کہ سب سے برے نام 'حرب' اور 'مرہ' ہیں۔

نسب کا حق

حسب ونسب کی حفاظت پر مذہب اسلام نے بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اس کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ عورت کو عدت کے چار ماہ کی مدت سے گزرانے کی اصل وجہ حسب ونسب کی پاکی ہے۔ ایک انسان چاہے کتنا ہی پڑھا لکھا ہو، قابل ہو، کتنا ہی مال ودولت والا ہو اور اگر وہ مجہول النسب ہو تو معاشرے میں اس کی کوئی وقعت نہیں رہتی ہے۔ وہ انسان تمام تر آرام وآسائش کے باوجود ایک نفسیاتی الجھن میں گھرا رہتا ہے۔ لوگ اسے ہر طرح کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ اس کے اندر خود اعتمادی

کی کمی پائی جاتی ہے۔اچھی محفلوں میں لوگ اسے بیٹھنے نہیں دیتے ہیں اور کسی بھی اچھے گھرانے میں شادی بیاہ کے رشتے استوار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اپنا حقیقی نسب تبدیل کرنے والے کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کے متعلق دعویٰ کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ اس کا باپ نہیں تو اس پر جنت حرام ہے۔''[۱۵]

''اپنے آباء و اَجداد سے منہ نہ پھیرو، جو اپنے باپ سے منہ پھیر کر دوسرے کو باپ بنائے تو یہ کفر ہے۔''[۱۶]

رضاعت کا حق

ماں کا بچہ کو دودھ پلانا رضاعت کہلاتا ہے۔اس دنیا میں آتے ہی بچہ کی سب سے اہم ضرورت دودھ ہوتی ہے جو اس کے لیے غذا کا کام کرتی ہے۔ بچہ اپنے طفولیت کے دور میں اسی دودھ پر منحصر ہوتا ہے۔اس غذا کی پورتی کرنا ماں باپ کی اہم ذمہ داریوں میں سے ہے۔رضاعت سے متعلق اللہ رب العزت اپنے بندوں کو جو حکم دیتا ہے وہ سورہ بقرہ کی ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے:

''اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس تک دودھ پلائیں یہ (حکم) اس کے لیے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے، اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور پہننا دستور کے مطابق بچے کے باپ پر لازم ہے، کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہ دی جائے، (اور) نہ ماں کو اس کے بچے کے باعث نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کی اولاد کے سبب سے اور وارثوں پر بھی یہی حکم عائد ہوگا، پھر اگر ماں باپ دونوں باہمی رضامندی اور مشورے سے (دو برس سے پہلے ہی) دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، اور پھر اگر تم اپنی اولاد کو (دایہ سے) دودھ پلوانے کا ارادہ رکھتے ہو تب بھی تم پر کوئی

گناہ نہیں جب کہ جو تم دستور کے مطابق دیتے ہو انھیں ادا کر دو، اور
اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان لو کہ بے شک جو کچھ تم کرتے ہو اسے
خوب دیکھنے والا ہے''[۱۷]

تعلیم حاصل کرنے کا حق

تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ قرآن نے واضح لفظوں میں عالم اور جاہل کے درمیان فرق بیان کر دیا ہے: **هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ.** [۱۸] اور اللہ کے رسولؐ نے علم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا: **طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ.** [۱۹] یعنی علم کا حاصل کرنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ بچہ کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا والدین کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ تعلیم کے معاملہ میں مذہب اسلام نے لڑکی اور لڑکے میں کوئی فرق نہیں کیا ہے اور نہ ہی دینی و دنیاوی تعلیم میں کوئی فرق کیا ہے۔ بنیادی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم دونوں کے لیے ضروری ہے۔ ہم تعلیم کے ذریعے بچوں میں اتنی لیاقت ضرور پیدا کر دیں کہ آگے چل کر کس میدان میں انھیں اپنی شناخت بنانی ہے اس کا انتخاب کر سکیں۔ تعلیم کے میدان میں لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کو بھی برابر کے مواقع فراہم کریں۔ لڑکوں کی طرح لڑکیوں میں بھی اللہ رب العزت نے سیکھنے اور سمجھنے کی فطری صلاحیت رکھی ہے۔ جب بھی میدان علم میں انہیں مواقع فراہم کیے گئے ہیں انہوں کبھی مایوس نہیں کیا۔ اسلامی تاریخ میں ہمیں ایسی بہت سی خواتین کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے علم حدیث اور علم القرآن میں نمایاں خدمات انجام دیئے ہیں اور بڑے بڑے تعلیمی ادارے قائم کر کے تعلیم کو عام کیا ہے۔ لڑکیوں کی اچھی تربیت کرنے والوں کو اللہ کے رسولؐ نے جنت کی بشارت دی ہے۔

عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : من عال ثلاث بنات فادبھن و زوجھن واحسن الیھن فلہ الجنۃ. [۲۰]

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کی رسول اللہ

صلی علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جس کے پاس تین لڑکیاں ہوں اور اس نے
ان کی اچھی تربیت کی پھر ان کی شادی کرادی اور ان کے ساتھ اچھا
معاملہ رکھا، تو ایسے شخص کے لیے جنت کی بشارت ہے۔

بعض احادیث میں دو لڑکیوں کی کفالت پر بھی جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ ہمیں چاہیے کی ہم اسلام کی صحیح تعلیمات کو جانیں اور ان کی روشنی میں اپنے بچوں کی صحیح تربیت کریں تاکہ وہ مستقبل میں اسلام اور اپنے خاندان کی سرخ روئی کا سبب بنیں اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کے مذہب اسلام نے بچوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کیا ہے یا اسلام میں حقوق اطفال سے متعلق تعلیمات موجود ہی نہیں ہیں۔

مصادر و مراجع

۱۔ سورہ الانعام:۱۵۱

۲۔ **مسلم، باب فضل الاحسان الی البنات**

۳۔ ایضاً

۴۔ **مسلم، الصحیح، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسه** ۱۳۲۴/۳، رقم ۱۶۹۶

۵۔ ایضاً: ۱۳۲۳/۳، ۱۳۲۴، رقم ۱۶۹۵

۶۔ سورہ الانعام: ۱۴۰/۶

۷۔ سورہ الانعام: ۱۵۱/۶

۸۔ سورہ بنی اسرائیل: ۳۱/۱۷

۹۔ **بخاری، باب قتل الولد خشیة ان یاکل معه**

۱۰۔ سورہ التکویر: ۹،۸/۸۱

۱۱۔ طبری، محمد بن جریر، **جامع البیان عن تاویل آی القرآن المعروف به تفسیر الطبری**، داراحیاء التراث العربی، بیروت (لبنان) طبع الاول، ۲۰۰۱ء، ۹۱/۳۰

۱۲۔ الہیثمی، **مجمع الزوائد**: ۱۲۸۲۹

۱۳۔ **ابوداؤد، السنن، کتاب الادب، باب فی تغیر الاسماء**، ۲۸۷/۴، رقم ۴۹۴۸.

۱۴۔ ایضاً: ۲۸۷/۴، رقم: ۴۹۵۰

۱۵۔ بخاری، الصحیح، کتاب الفرائض، باب من ادعی،۲۴۸۵/۶،رقم:۶۳۸۵۔ا
۱۶۔ بخاری الصحیح، کتاب بداء ا لخلق، باب ما جاء فی قوله،۶:۲۴۸۵،رقم:۶۳۸۶۔ا
۱۷۔ سوره البقره،۲/۲۳۳
۱۸۔ سوره الزمر:۹
۱۹۔ سنن ابن ماجه۲۲۴، باب فضل العلماء
۲۰۔ سنن ابی داؤد۵۱۴۷،با ب فی فضل یتمی

محمد صلاح الدین ایوبی *

ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز: ایک تعارف

اسلامک اسٹڈیز ایک وسیع وعریض موضوع ہے۔ اس موضوع کے اہم پہلوؤں میں مسلم حکومتوں کی تاریخ، ان کا عروج وزوال، ان حکومتوں کا نظم ونسق، اسلامی تہذیب وثقافت، اسلامی علوم، فنون لطیفہ وفن تعمیر، اسلامی افکار ونظریات، تصوف وکلام، مسلم فرقے، مسلم تحریکات وادارے، سب شامل ہیں۔ اسلامک اسٹڈیز بظاہر ایک مضمون کا نام ہے لیکن درحقیقت یہ اپنے اندر بہت سے مضامین کو سموئے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر عطاء اللہ صدیقی لکھتے ہیں:

> Islamic Studies means studies concerning Islam, covering all its aspects - cultural and religious, economic and political, social and philosophical, past and present, regional and universal. This study has now emerged from a melange of several disciplines into one well-defined discipline.[1]

''اسلامک اسٹڈیز کا مطلب ہے اسلام سے متعلق مطالعات جو اسلام کے

*ریسرچ اسکالر شعبۂ اسلامیات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، ای میل: salahuddinaiyubi@gmail.com

تمام پہلوؤں کو محیط ہو مثلاً تہذیب، مذہب، اقتصادیات، سیاست، سماج اور فلسفہ وغیرہ، خواہ ان سب کا تعلق ماضی سے ہو یا حال سے، اور خواہ علاقائی ہو یا عالمی۔ یہ مطالعہ اب متعدد مضامین کے ساتھ مل کر ایک مکمل مضمون کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔''

اسلام کا مطالعہ دورِ اول سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ دسویں صدی میں مسلم اندلس کے اندر اس مطالعہ میں اس وقت باقاعدگی اور تنظیم آئی۔ جب یورپ کے بہت سے پادریوں اور دوسرے لوگوں نے اسپین کے شہر قرطبہ اور غرناطہ میں آ کر علم حاصل کرنا شروع کیا۔ صلیبی جنگوں کے دوران اور اس کے بعد اس میں تیزی آئی اور مزید نظم وضبط پیدا ہوا لیکن اسلام کو ایک سبجکٹ اور موضوع کی حیثیت سے سمجھنے کا آغاز سب سے پہلے انیسویں صدی میں یورپ میں ہوا۔

اسلامک اسٹڈیز کا آغاز وارتقاء

اسلامک اسٹڈیز کے آغاز کا جب ہم سراغ لگاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں اس کی جڑیں استشراق سے جا ملتی ہیں، کیوں کہ جس دور کو اسلامک اسٹڈیز کا آغاز بتایا جاتا ہے، اسی کو استشراق کا نقطہ آغاز بھی قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اسلامک اسٹڈیز کے آغاز کے تعلق سے مارٹن رچرڈ سی (Martin Richard C 1938-2019) لکھتے ہیں:

> Islamic studies arose in the ninth century in Iraq, when the religious sciences of Islam began to take their present shape and to develop within competing schools to form a literary tradition in Middle Arabic.[۲]

''اسلامک اسٹڈیز کا آغاز نویں صدی میں عراق میں ہوا جب اسلام کے مذہبی علوم نے اپنی موجودہ شکل اختیار کرنا شروع کیا اور مسابقتی اسکولوں میں ترقی کرنا شروع کیا تاکہ عربی میں ایک ادبی روایت قائم ہو سکے۔''

رہی بات تحریک استشراق کے آغاز کی تو اس کے نقطۂ آغاز کے بارے میں مسلمان اہلِ علم کی رائیں مختلف ہیں۔ ان میں سب سے قوی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ استشراق کا باقاعدہ آغاز

آٹھویں صدی عیسوی میں اندلس کی فتح کے بعد ہوا جب یورپ سے نوجوان اندلس کی اسلامی سلطنت کی معروف جامعات میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آنا شروع ہوئے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی رائے میں بھی تحریک استشراق کا آغاز ان یورپین راہبوں سے ہوا جنھوں نے مشرقی علوم وفنون کے حصول کی خاطر اندلس کا سفر کیا۔ ان راہبوں میں جربرٹ آف اوریلیک Gerbert of Aurillac (946-1003) بھی شامل ہے جو بعد میں سلویسٹر دوم Pope Sylvester II کے نام سے پوپ کے عہدے پر بھی فائز ہوا۔[۳]

اس رائے کی تائید ان مسلم اسکالرز کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے جو استشراق کے ماہرین ہیں، جن میں پروفیسر سید مقبول احمد اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کے نام سرفہرست ہیں، انہوں نے استشراق کے ادوار ومراحل بیان کرتے ہوئے پہلا مرحلہ اور پہلا دور اس زمانہ کو قرار دیا جب اہلِ مغرب حصولِ علم کے لیے اسپین کے مسلم علماء ومدارس کی طرف متوجہ ہوئے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر خود بہت سے مغربی اسکالرز نے صاف لفظوں میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اسلامک اسٹڈیز کا آغاز استشراق سے ہوا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اسلام کے مطالعہ کی ابتدا پر تبصرہ کرتے ہوئے یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا چیپل ہل کے ڈپارٹمنٹ آف ریلیجس اسٹڈیز کے پروفیسر ڈاکٹر کارل ڈبلیو ارنسٹ Carl W. Ernst (Born:1950) لکھتے ہیں:

"What we today can call Islamic studies emerged from Orientalism".[۴]

''جسے آج ہم اسلامک اسٹڈیز کہہ سکتے ہیں وہ استشراق سے نکلا ہے۔''

اور یہی بات مشہور اسکالر البرٹ ہورانی (Albert Hourani-1915-1993) نے بھی کہی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"Historically, the study of Islam and Muslim society as an academic field in Britain has its foundations in Orientalism."[۵]

''تاریخی طور پر، برطانیہ میں ایک علمی شعبے کے طور پر اسلام اور مسلم معاشرے کے مطالعہ کی بنیادیں استشراق میں ہیں۔''

پروفیسر سید مقبول احمد لکھتے ہیں کہ اسلامک اسٹڈیز یوں تو بظاہر نیا مضمون لگتا ہے لیکن یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ اورینٹلزم۔[۶] پروفیسر سید مقبول احمد ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''اسلامک اسٹڈیز کوئی نیا مضمون نہیں، نام نیا ہے، لیکن اس پر تقریباً دو صدیوں سے باقاعدہ کام ہو رہا ہے۔ اس کی ابتدا اور نشو ونما کو سمجھنے کے لیے ہمیں اسے تاریخی پسِ منظر میں دیکھنا ہوگا۔ یورپ میں اسلام کو کن نظروں سے دیکھا گیا اور رفتہ رفتہ اورینٹل اسٹڈیز کی ابتدا کیسے ہوئی اس کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔''[۷]

ڈاکٹر وارث متین مظہری لکھتے ہیں:

مغربی میں پہلے 'ایریا اسٹڈیز'، 'مڈل ایسٹرن اسٹڈیز'، 'ریلیجس اسٹڈیز' کے عناوین سے اسلام اور مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے مختلف موضوعات تدریس وتحقیق کے دائرے میں شامل تھے۔ لیکن اب ان کی جگہ ''اسلامک اسٹڈیز'' کے عنوان نے لے لی ہے۔[۸]

انیسویں صدی میں اسلامک اسٹڈیز

اسلام اور مسلم تہذیب وثقافت کا ایک موضوع کی حیثیت سے مطالعہ انیسویں صدی میں یورپ میں شروع ہوا۔ چنانچہ یورپ میں اسلامک اسٹڈیز کے آغاز کی تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر عنایت اللہ لکھتے ہیں:

''بلادِ مغرب میں جب مشرقی ملکوں کا تحقیقی مطالعہ شروع ہوا تو ابتدا میں مستشرقین کی توجہ بیشتر مشرقی زبانوں اور ان کے متعلقہ آداب پر مبذول رہی، اس کے بعد تاریخ وتمدن کی باری آئی۔ باقی رہے مذاہب وادیان تو ان کی بحث اگرچہ ان کے دائرۂ تحقیق سے بالکل خارج نہ تھی تاہم ایک مدت دراز تک ان پر خصوصی توجہ نہ دی جاسکی، آخر کار جب ان کی طبیعتیں لسانی (Philological) اور ادبی (Literary) مباحث سے قدرے

سیر ہو چکیں تو ان کی توجہ رفتہ رفتہ اسلامی دینی علوم کی طرف منعطف ہوئی اور اس توجہ کا بالآخر یہ نتیجہ ہوا کہ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں اسلامک اسٹڈیز نے ایک مستقل شعبہ کی حیثیت اختیار کی، یورپ میں اسلامک اسٹڈیز کی جس طرح تشکیل ہوئی اس کی ایک واضح تاریخ ہے۔'' [۹]

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں نامور مستشرقین کے ایک طبقہ نے جدید یورپ میں علمی انداز میں اسلامی علوم کی تحقیق شروع کی اور ان کی مجموعی علمی سرگرمیوں سے اسلامک اسٹڈیز نے بتدریج ایک مستقل فن کی صورت اختیار کی۔ اس تعلق سے مشہور جرمن مستشرق پروفیسر نولڈ کے Nuldeke (وفات ۱۹۳۰ء)، ہنگری کے مستشرق پروفیسر گولڈ زیہر (1850-1921) Ignaz Gold Zihar، ڈچ مستشرق پروفیسر سنوک ہرخونیہ (1857-1936) Snouch Hurgronje اور جرمن مستشرق ولہازن (1844-1918) Wellhausen Julius وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں، جن کے کام کا میدان بالترتیب قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ ہے۔ ان نامور دانشوروں کی تحقیقات وتصنیفات نے یورپ کے علمی حلقوں میں اسلامک اسٹڈیز کو ایک فن کی شکل میں ابھرنے میں کافی کردار ادا کیا۔

ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز کا آغاز

یورپ کے زیر اثر بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہندوستان میں باقاعدہ اسلامک اسٹڈیز کی ابتدا ہوئی۔ چنانچہ ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز کے سبجکٹ کا آغاز سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۲۰ء میں ہوا، اور بی۔ اے اور ایم۔ اے کے کورسز میں اسلامک اسٹڈیز کو شامل کیا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک متعدد یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کو شامل نصاب کیا گیا اور کئی یونیورسٹیوں میں باقاعدہ اسلامک اسٹڈیز کے شعبے قائم کئے گئے۔ ان یونیورسٹیوں میں چند اہم نام حسبِ ذیل ہیں: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)، جامعہ ہمدرد (نئی دہلی)، عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد)، کشمیر یونیورسٹی (سری نگر) کشمیر اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی (اونتی پورہ، جموں وکشمیر)، بی ایس عبدالرحمٰن کریسنٹ انسٹیٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی (وندلور، تمل ناڈو)، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (حیدرآباد)، سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر (جموں وکشمیر)، عالیہ یونیورسٹی

(کلکتہ)، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی (راجوری، جموں وکشمیر)، مولانا مظہر الحق عربک اینڈ پرشین یونیورسٹی (پٹنہ، بہار) اور محمد علی جوہر یونیورسٹی (رام پور، اتر پردیش) وغیرہ۔

اسلامک اسٹڈیز اس وقت ایک پسندیدہ علمی موضوع ہے۔ مختلف وجوہ سے اس کا مستقبل تاب ناک اور حال انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔[۱۰] موجودہ دور میں اسلامک اسٹڈیز نے ایک مستقل سبجکٹ اور ڈسپلن کی حیثیت حاصل کر لی ہے جو کہ کچھ پہلے تک اورینٹل اسٹڈیز کا ایک حصہ تھا۔ تبدیلی تدریجی طور پر ہوئی ہے۔ اسلامک اسٹڈیز اپنی خصوصیات کی وجہ سے ایک انٹر اور ملٹیڈسپلینری سبجکٹ (بین تخصصات وکثیر تخصصات موضوع) ہے جس کے تحت مذہب، تاریخ، سماج وثقافت، معاش وسیاست اور علم وسائنس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے نصاب میں صرف مذہب اسلام، دینیات اور فلسفہ ہی نہیں ہے بلکہ پوری اسلامی تہذیب نصاب کا حصہ ہے اور وہ زبانیں بھی جو خود اس تہذیب میں بیان کی گئی ہیں۔[۱۱]

ہندوستان میں لفظ اسلامک اسٹڈیز کا سب سے پہلا استعمال

ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز کی اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے برطانوی نوآبادیاتی نظام کے قائم ہونے کے بعد ملتا ہے۔ اس کی ابتدائی تاریخ کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز کی اصطلاح سب سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی کمیشن (۲۰-۱۹۱۷ء) کی رپورٹ میں استعمال ہوئی ہے۔ کمیشن کے صدر سر مائیکل سڈلر تھے، اس میں مسلمانوں کی تعلیم اور اسلامک اسٹڈیز سے متعلق کمیشن کی تجاویز ایک خاص باب میں قلم بند ہوئی تھیں۔[۱۲] اس کے بعد ہندوستان میں لفظ اسلامک اسٹڈیز کا سب سے پہلے استعمال اس وقت ہوا جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایگزیکٹیو کونسل (مجلس عاملہ) نے اسلامک اسٹڈیز کو ایک سبجکٹ کے طور پر منظوری دی۔ اسی طرح اسلامک اسٹڈیز کے لفظ کا اس ملک میں ایک اور قدیم استعمال اس وقت ملتا ہے جب حکومت بہار نے وہاں کے تسلیم شدہ ۱۳۰۰ مدرسوں سے متعلق کاموں کی نگرانی اور ان پر نظر رکھنے کے لیے پہلی بار سپرنٹنڈنٹ (ناظم/سربراہ اسلامی علوم ومعارف) آف اسلامک اسٹڈیز کے نام سے ایک عہدہ کی تشکیل کی۔ علی اشرف اپنی کتاب ''بہار کے مسلم خواص'' میں لکھتے ہیں:

''اس وقت تیرہ سو (۱۳۰۰) تسلیم شدہ مدرسے ہیں جن میں ایک لاکھ کے قریب طلبہ کے نام درج ہیں... مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ جسے اصل میں ۱۹۱۲ئمیں سید نورالہدیٰ نے قائم کیا تھا، پہلا مدرسہ ہے جسے حکومت نے اپنے انتظام میں لیا۔ آہستہ آہستہ جب مدرسوں کی تعداد بڑھی تو حکومت بہار نے مدرسے کے کاموں کی دیکھ بھال کے لیے سپرنٹنڈنٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ایک عہدہ کی ۱۹۲۲ئمیں تشکیل دیا اور مدرسہ اکزامنیشن بورڈ قائم کیا گیا۔''[۱۳]

ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز کی اہمیت ومعنویت

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کے اعتبار سے اگر ہم دیکھیں تو ہمارا ملک ہندوستان بہت سے اسلامی ملکوں سے بھی بڑا ہے۔ یہاں مسلمان صدیوں سے آباد ہیں۔ اسی لیے اسلام کو اچھی طرح سمجھے بغیر ہندوستان کی تہذیب وثقافت کو نہ اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس کا تعارف کرایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز کی اہمیت کی اگر دوسری وجوہات نہ بھی ہوں تب بھی یہی ایک وجہ اس کی ضرورت واہمیت کے لیے کافی ہے۔ اسلام کا مطالعہ نہ صرف مذہبی حیثیت سے کیا جانا چاہیے بلکہ اس لیے بھی کیا جانا چاہیے کہ یہ عالمی تہذیب کی ایک زندہ اور متحرک طاقت ہے۔ اسی وجہ سے اسلامک اسٹڈیز کو ہندوستان میں مقبولیت حاصل ہوئی۔[۱۴]

ہندوستان جیسے ملک میں اسلامک استڈیز کی اہمیت ومعنویت کو اجاگر کرتے ہوئے اور اس پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سینئر استاذ اور موجودہ صدر شعبہ پروفیسر اقتدار محمد خان لکھتے ہیں:

''ہندوستان جیسے تکثیری معاشرے میں جس کے خمیر میں اسلام شامل ہے اور جس کی تاریخ وثقافت کی تشکیل میں اسلام نے بنیادی رول ادا کیا ہے، اسلامک اسٹڈیز اسلام کی تہذیبی خصوصیات کو اجاگر کرنے کا ذریعہ ہے۔ ہندوستان کے تناظر میں اسلامک اسٹڈیز کی اہمیت ومعنویت کا ایک اور پہلو قابلِ ذکر ہے، ہندوستان میں مدارس کی شکل میں ہزاروں کی تعداد میں

معیاری تعلیمی ادارے پائے جاتے ہیں، جہاں سے بڑی تعداد میں فضلاء نکلتے ہیں۔ دوسرے تمام شعبوں کے مقابلے میں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ انھیں عصری تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ مدارس کے فضلاء کو موجودہ عہد میں اسلام اور اسلامی فکر وتہذیب کی نمائندگی کا جو فریضہ عالمی سطح پر انجام دینا ہے، اس کے لیے اسلامک اسٹڈیز ان کی فکری صلاحیتوں کی آبیاری کا اہم ذریعہ ہے۔ چنانچہ اسلامک اسٹڈیز میں داخلہ لینے والے مدارس کے فضلاء کی تعداد میں سال بہ سال تیزی کے ساتھ اضافہ ہورہا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ایک روشن خیال عالم دین تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مدارس کے فضلاء کو مدرسہ کی تعلیم کی تکمیل کے بعد عصری سرکاری جامعات میں تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ ان کے لفظوں میں ''یہ بات ان کے حق میں مؤید ہوگی''۔ یہ بات کل جس قدر اہمیت ومعنویت کی حامل تھی اس کے مقابلے میں آج اس کی اہمیت ومعنویت کئی گنا زیادہ ہے۔ حیرت وافسوس کی بات یہ ہے کہ اہل مدارس نے اس پہلو کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنایا۔ چنانچہ ڈیڑھ سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود مدارس اور عصری جامعات کے درمیان گہرے فاصلے ہیں۔ ان فاصلوں کو ختم کرنے میں دوسرے کسی بھی شعبہ کے مقابلہ میں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ اور اس کا نصاب زیادہ تعمیری اور مثبت کردار ادا کرسکتا ہے اور فی الواقع کر بھی رہا ہے۔'' [۱۵]

ہندوستان کی عصری جامعات میں اسلامک اسٹڈیز

بطور ایک سبجیکٹ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کا آغاز سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۲۰ء میں ہوا، اور بی اے۔ اور ایم اے کے کورسز میں اسلامک اسٹڈیز کو شامل کیا گیا۔ [۱۶] اس کے بعد سے اب تک متعدد یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز داخلِ نصاب ہے۔

ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے آغاز کے تعلق سے ڈاکٹر محمد عرفان احمد لکھتے ہیں:

''جامعاتی سطح پر ایک موضوع کی حیثیت سے اسلامک اسٹڈیز پہلی مرتبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۲۰ء میں تسلیم کیا گیا، اس کے تقریباً 35 سال بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مارچ ۱۹۵۴ء میں دی انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز قائم ہوا۔ آگے چل کر مستقل شعبہ اسلامک اسٹڈیز قائم ہوا۔ ۱۹۷۱ء پری یونیورسٹی درجہ میں بھی اسلامک اسٹڈیز ایک مضمون کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن نے، جس کے صدر رادھا کرشنن تھے، ہیومنسٹک ریسرچ کے تحت اپنی سفارشات میں جہاں مختلف مذاہب کی تدریس وتحقیق کے حوالے سے ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں کو مشورہ دیا، وہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کو فروغ دینے کے تعلق سے کہا کہ

Aligarh University Should be encouraged to develop a strong Centre for Islamic Studies.[۱۷]

۹/۱۱ کے بعد اسلامک اسٹڈیز کی طرف اور بھی تیزی کے ساتھ لوگوں کا رجحان ہوا ہے اور اسلامی موضوعات پر مختلف جہتوں سے تحقیقی اور علمی کام کا آغاز ہوا۔ ذیل کی سطروں میں ہندوستان کی چند اہم یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کی تاریخ کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۱۹۲۰ء میں جب محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا درجہ ملا تو اسی سال اسلامک اسٹڈیز کو بی اے اور ایم اے کی سطح پر یونیورسٹی میں تسلیم کیا گیا، لیکن اسلامک اسٹڈیز کی تدریس کا آغاز ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ اس وقت اس کو شعبہ عربی کے تحت رکھا گیا، اور اس شعبہ کو ''شعبہ عربی واسلامک اسٹڈیز'' کا نام دیا گیا۔ [۱۸] ۱۹۵۴ء میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے نام سے الگ سے ایک ادارہ قائم کیا گیا، لیکن اس وقت انسٹی ٹیوٹ کے دائرہ کار میں اسلامک اسٹڈیز کی تدریس شامل نہیں کی

گئی، بلکہ اس کا کام صرف ریسرچ وتحقیق کرنا تھا۔ اسلامک اسٹڈیز کی تدریس اب بھی شعبہ عربی کے تحت تھی۔ ۱۹۶۸ء میں اسلامک اسٹڈیز کی تدریس شعبہ عربی سے الگ کر کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے حوالے کی گئی، جواب ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی حیثیت سے فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے تحت کام کرنے لگا تھا۔ اس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کا قیام ۱۹۵۴ء میں ایک تحقیقی ادارہ کے طور پر عمل میں آیا۔ نیز اس شعبہ کو دیگر شعبہ جات سے بھی منسلک کر دیا گیا جیسے شعبہ فلسفہ، شعبہ سیاسیات اور شعبہ تاریخ۔ بی اے اور ایم اے کی سطح پر اسلامک اسٹڈیز کی شروعات اگر چہ ۱۹۵۰ء میں ہوگئی تھی لیکن اس وقت اسلامک اسٹڈیز میں مسلم دنیا کی علاقائی تاریخ پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، بعد میں اس میں دیگر مضامین بھی شامل کیے گئے۔ اس شعبہ میں تدریس کے ساتھ ساتھ ریسرچ وتحقیق کا کام بھی شروع سے جاری ہے، بلکہ ۱۹۵۴ء میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا قیام ریسرچ وتحقیق کے کاموں کے لیے ہی عمل میں آیا تھا، [19] جو شعبہ سے علیحدہ تحقیقی کاموں میں مصروف تھا۔ ۱۹۶۸ء میں شعبہ کو انسٹی ٹیوٹ کے تابع کر دیا گیا۔ ہم نے جب یہاں کے تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا تو ہم نے دیکھا کہ سب سے قدیم پی ایچ ڈی کا مقالہ جو یہاں جمع کیا گیا وہ ۱۹۶۰ء میں جمع ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک یعنی ۲۰۲۱ء تک یہاں ۱۱۶ پی ایچ ڈی کے مقالے جمع کیے گئے اور ان پر ریسرچ اسکالرز کو پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی گئیں۔ اسلامک اسٹڈیز کے حوالے سے یہ تعداد ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ عنقریب دیگر یونیورسٹیوں کے اسلامک اسٹڈیز کے پی ایچ ڈی کے مقالوں کی تعداد بھی آتی ہے۔ اس وقت شعبہ میں بارہ اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، اور ان کی نگرانی میں ریسرچ اسکالرز اپنے تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نصاب میں اسلامک اسٹڈیز اسی دن سے شامل ہے جب ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں اس جامعہ کا آغاز ہوا تھا۔ [20] ملک کے ممتاز علماء اور اسکالرز نے یہاں اختیاری اور لازمی مضمون کی حیثیت سے اس کی تدریس کی خدمات انجام دی ہیں، جن میں چند نمایاں نام مولانا محمد علی جوہر، مولانا اسلم جیراج پوری، مولانا محمد عبدالسلام ندوی، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، پروفیسر

مشیرالحق اور پروفیسر ماجد علی خان وغیرہ کے ہیں۔

۱۹۷۵ء میں اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز کے نام سے ایک مشترکہ شعبہ قائم کیا گیا، بعد میں ۱۹۸۸ء میں اسلامک اسٹڈیز کو ایک مستقل اور بااختیار شعبہ کی حیثیت دی گئی۔ اس شعبہ میں بی اے آنرس اور ایم اے کے علاوہ بی اے کے طلبہ کے لیے اسلامیات اور ہندوستانی مذاہب اور تہذیب کے عنوان سے دو لازمی پرچے بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی سطح پر سمسٹر کا نظام قائم ہے۔ بی اے کی سطح پر ۱۸ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ شعبہ پی ایچ ڈی پروگرام بھی فراہم کرتا ہے۔ اس وقت شعبہ میں ۹ مستقل اساتذہ تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ شعبہ کے قیام سے اب تک یہاں تقریباً ۹۰ پی ایچ ڈی مقالات لکھے جا چکے اور ان پر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی جا چکی ہیں۔

جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

جامعہ ہمدرد کا قیام ۱۰ر مئی ۱۹۸۹ء میں عمل میں آیا۔ جامعہ ہمدرد کے قیام سے بہت پہلے ۱۹۶۳ء میں، حکیم عبدالحمید نے اسلامی ثقافت وتہذیب کے مطالعہ کو فروغ دینے، خاص طور پر ہندوستانی معاشرے اور ثقافت میں اسلامی ثقافت وتہذیب کی شراکت کو فروغ دینے کے مقصد سے ''انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ جامعہ ہمدرد کے قیام کے بعد اس ادارہ کو شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں تبدیل کر کے جامعہ ہمدرد کے کیمپس میں منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں اس شعبہ کا قیام خود یونیورسٹی کے قیام سے بھی پہلے عمل میں آیا۔ بلکہ اسی شعبہ نے ۱۹۸۹ء میں جامعہ ہمدرد کے قیام کے لیے بنیاد فراہم کی۔ یہ شعبہ تحقیق اور تدریس میں سرگرم عمل ہے۔ یہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے تین پروگرام پیش کرتا ہے: بی اے (آنرس)، ایم اے اور پی ایچ ڈی پروگرام۔ [۲۱]

عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کا قیام ۱۹۶۵ء میں جرمنی کے وزیٹنگ پروفیسر ہنس کروس کی سرپرستی میں عمل میں آیا۔ [۲۲] اس وقت یہ اورینٹل اسٹڈیز کا ایک حصہ تھا۔ عثمانیہ

یونیورسٹی میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی بنیاد استشراقی روایت پر رکھی گئی تھی، لیکن پروفیسر انور معظم، پروفیسر سلیمان صدیقی، ڈاکٹر محمد احمد اللہ اور ڈاکٹر شاہد علی عباسی کی یکے بعد دیگرے صدارت کی وجہ سے اس شعبہ نے ایک قطعی ہندوستانی شکل اختیار کر لی۔ شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں اسلام میں علم کے فروغ اور دیگر مذاہب وادیان کے ساتھ اس کے تعلقات کی بہتر تفہیم کا تصور پایا جاتا ہے ۔[۲۳]

یہ شعبہ مختلف علمی شعبوں کے باہمی تعامل کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تا کہ مذہب اور سماج کے مسائل کی اہم معلومات کے حصول کو آسان بنایا جا سکے اور مذہبی تکثیریت کو برقرار رکھنے اور قوموں کے درمیان باہمی اعتماد کو فروغ دینے کی اہمیت سے بہتر انداز میں آگاہ کر کے بہتر سماجی تعلقات کو فروغ دیا جا سکے۔ یہاں اسلام کو اس کی تاریخی، سماجی، سیاسی اور اس کی بشریاتی تناظر میں پڑھایا جاتا ہے، جو کہ مسلمانوں کے خالص مذہبی تناظر وسخت گیر نظریہ اور مستشرقین کے تعصّبات وجانبدارانہ پہلوؤں سے پاک ہوتا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں یہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی تدریس اور تحقیق کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اس شعبہ نے ۲۰۱۵ء میں گولڈن جبلی کی تقریب بھی منائی، جس میں کانفرس، سمینار اور لکچرز کا انعقاد بھی کیا گیا۔

ایم اے کی سطح پر قرآن، حدیث، فقہ، اسلامی تہذیب کی تاریخ، سماجی و سیاسی فکر اور جدید رجحانات پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ شعبہ اسلام اور مسلم سوسائٹی کے بارے میں بنیادی معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔ تصوف سے متعلق چیزیں بھی نصاب میں شامل ہیں، جس سے روحانیت اور بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ سماجی، اقتصادی اور سیاسی ترقیات پر بھی ان کورسز میں توجہ دی جاتی ہے۔ عصر حاضر میں ہو رہی سیاسی ترقیات کے بارے میں معلومات فراہم کرنا عالمی تناظر میں مسلم سوسائٹیز کی ضرورت بن چکی ہے۔

ان چیزوں کو مدنظر رکھ کر جو کورسس ترتیب دیئے گئے ہیں ان میں طلبہ کے اندر نسلی مسائل کی تفہیم، حسد وعناد، نسلی تفریق، قانونی اصطلاحات اور بنیاد پرستی کی تفہیم شامل ہے۔ مسلم اصلاحی تحریکوں پر مشتمل کورس طلبہ کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ سول سروسیز اور دوسرے مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لیں، جو ہندوستان کی مرکزی حکومت اور دوسری ریاستیں منعقد کرتی ہیں۔ اسلام کے جدید رجحانات اور ہندوستان میں مسلم فکر کا فروغ طلبہ کو معاصر اسلامی فکر کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔ CBCS کے تحت شعبہ نے کچھ نئے کورس کو متعارف کرایا ہے، جن میں اسلام کا تعارف، خواتین اور سیاست معاصر ایران میں، مستشرقین اور اسلام اور ابھرتے ہوئے ریسرچ پروجکٹ۔ اس شعبہ میں اس وقت صرف دو

اساتذہ تدریسی خدمات پر مامور ہیں۔اس شعبہ میں اسلامک اسٹڈیز کے دو کورس فراہم ہیں: ایم اے اور پی ایچ ڈی۔ بی اے یہاں موجود نہیں ہے۔شعبہ کے قیام سے اب تک یہاں صرف ۲۶ پی ایچ ڈی کے مقالات لکھے گئے۔[۲۴] شعبہ کے قیام سے اب تک کی مدت کو اگر ہم دیکھیں تو مقالوں کی یہ تعداد اس طویل مدت کی بہ نسبت انتہائی قلیل ہے۔

کشمیر یونیورسٹی

کشمیر یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ ''شاہ حمدان انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز'' کے نام سے ۱۹۸۸ء میں قائم ہوا۔[۲۵] اس شعبے میں تین کورسس زیرِ تعلیم ہیں: (۱) ایم اے اسلامک اسٹڈیز [دو سال]، (۲) پی ایچ ڈی [دوسال]، (۳) انٹی گریٹیڈ ایم۔فل/ پی ایچ ڈی [تین سال]۔انسٹی ٹیوٹ ایک علمی اور تحقیقی جریدہ Insight Islamicus شائع کرتا ہے، جس کے مضامین بین الاقوامی سطح پر Index Islamicus، لندن، میں ترتیب دیئے گئے ہیں۔انسٹی ٹیوٹ تنقیدی، معروضی اور تجزیاتی فکر وسوچ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی، رواداری، غیر جانبداری، بقائے باہمی اور معاشرے کا تکثیری نقطہ نظر جیسے معاصر انسانی اقدار کو فروغ دیتا ہے۔

اس شعبے میں دو مستقل اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ان کے علاوہ چار گیسٹ فیکلٹی ہیں۔شعبہ میں ایک لائبریری بھی ہے جس میں دس ہزار سے زائد کتابیں اور علمی جرائد ورسائل موجود ہیں۔

مدراس یونیورسٹی

یونیورسٹی آف مدراس ایک اسٹیٹ یونیورسٹی ہے، یہ ہندوستان کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔اس کا قیام ۵ر ستمبر ۱۸۵۷ء میں عمل میں آیا۔[۲۶] یونیورسٹی آف مدراس میں ساوتھ انڈین ایجوکیشنل ٹرسٹ کی گرانٹ سے ''جسٹس بشیر احمد سعید سنٹر فار اسلامک سٹڈیز'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا۔جسٹس بشیر احمد سعید ایک عظیم انسان تھے جنھوں نے باہمی افہام وتفہیم کے ذریعے ہم آہنگی کو فروغ دینے کی ضرورت کو سمجھا اور اس کی کوشش کی۔ان ہی کے نام پر اس ادارہ کا قیام عمل میں آیا۔یہ سنٹرل تمل ناڈو میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے جو سال ۲۰۰۲ء میں وجود میں آیا۔[۲۷] یہاں صرف

ایک استاذ ہیں جو اسسٹنٹ پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔[۲۸] یہاں اسلامک اسٹڈیز کے صرف دو پروگرام دستیاب ہیں۔ایک ایم اے اسلامک اسٹڈیز، دوسرا ایم فل۔[۲۹]

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کا قیام ۲۰۱۳ء میں عمل میں آیا۔اس شعبہ میں ایم اے اور پی ایچ ڈی پروگراموں کے علاوہ ایک ڈپلوما کورس بھی دستیاب ہے۔شعبہ کی جانب سے انڈر گریجویٹ پروگراموں کے لیے ایک بنیادی کورس اور ایک لازمی کورس کے طور پر بھی اسلامیات کی تدریس فراہم کی جاتی ہے۔[۳۰]

یہ شعبہ نان سی جی پی اے پرچہ کے طور پر کالج بیک گراؤنڈ سے آنے والے طلبا کے لیے ''اسلامیات'' کے عنوان سے ایک پرچہ پیش کرتا ہے اور مدرسہ بیک گراؤنڈ سے آنے والے طلبا کے لیے ''دنیا کے بڑے مذاہب'' کے نام سے ایک پرچہ پیش کرتا ہے۔جدید تناظر میں اسلامک اسٹڈیز کی تدریس اور تحقیق اس شعبہ کا اہم مقصد ہے۔دور حاضر میں اسلام بالخصوص اس کے سیاسی نظریات اور سماجی طرز عوامی مباحث کا مرکز بن چکا ہے۔اس کے علاوہ اسلام اپنی تہذیب و ثقافت اور بالخصوص ہندوستان کے حوالے سے ایک طویل تاریخ کا حامل ہے۔انسانی زندگی کے مختلف میدانوں میں اس کے کارنامے انتہائی اہم اور منفرد ہیں۔انسانیت کی فلاح و ترقی میں اس نے قابلِ ذکر کردار ادا کیا ہے۔یہ پہلو آج کی علمی دنیا میں تحقیق و مطالعہ کے موضوعات ہیں۔شعبہ میں اسلامی علوم، اسلامی ثقافت، اسلامی تہذیب، اسلامی تصوف اور اسلامی افکار کے وسیع میدانوں کا مطالعہ کرایا جاتا ہے تاکہ محققین کو اسلامک اسٹڈیز کے موضوع پر تحقیق کی تربیت فراہم کی جاسکے۔[۳۱]

شعبہ کا اہم میدان کار اسلامی علوم کا گہرا مطالعہ، جدید عہد کا ایک جامع شعور، بین عقائد تعلقات کے لیے علم دین کی بنیادوں کی تفہیم، تکثیری سماج میں مسلمانوں کا رول اور اسلامی مطالعات نیز ہندوستان میں رہنے والے مسلمان ہیں۔[۳۲]

اس کے علاوہ مانو کے دو سیٹلائٹ کیمپس ہیں ایک بڈگام کشمیر میں اور دوسرا لکھنؤ میں۔کشمیر میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا سیٹلائٹ کیمپس مانو آرٹس اینڈ سائنس کالج برائے خواتین کے نام

سے ہے، اس کا قیام ۲۰۱۵ء میں بڈگام میں عمل میں آیا، تاکہ یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد کہ تعلیم کے ذریعے خواتین کو بااختیار بنایا جائے، اس کی تکمیل ہو سکے۔ کالج نے خواتین کے لیے ۲۰۱۹ء میں مخلوط تعلیم کا آغاز کیا۔ یہ کالج خواتین کا پہلا ادارہ ہے، جسے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ریاست جموں وکشمیر میں قائم کیا ہے جو اردو میڈیم کے ذریعے مختلف باقاعدہ ایم اے اور پی ایچ ڈی پروگرام پیش کرتا ہے۔[۳۳] یہاں فی الحال چار شعبے قائم ہیں: شعبہ اسلامک اسٹڈیز، شعبہ معاشیات، شعبہ اردو اور شعبہ انگلش۔[۳۴]

لکھنؤ میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا سیٹلائٹ کیمپس سال ۲۰۰۹ء میں قائم کیا گیا، یہ کیمپس شباب مارکیٹ کے قریب ٹیگور مارگ میں واقع ہے۔ یہ کیمپس انگریزی، اردو، فارسی اور عربی کے مضامین میں کل وقتی باقاعدہ ایم اے کورس پیش کرتا ہے۔ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی بھی متعارف کروائی ہے۔ کیمپس میں دستیاب تمام مضامین (یعنی عربی، انگریزی، فارسی اور اردو) میں سال ۲۰۱۷ء سے پروگرام۔ تعلیمی سال ۲۰۱۸ء سے بیچلر آف آرٹس پروگرام بھی متعارف کیا گیا ہے۔ اس کیمپس سے پوسٹ گریجویٹ طلباء کا پہلا بیچ ۲۰۱۱ء میں پاس آؤٹ ہوا۔[۳۵]

سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر

سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر کا قیام ۲۰۰۹ء میں عمل میں آیا۔[۳۶] اس یونیورسٹی میں ریلیجس اسٹڈیز کا شعبہ ۲۰۱۵ء میں قائم کیا گیا۔ یہ شعبہ تقابلی مذہب اور اسلامک اسٹڈیز میں ماسٹرز پروگرام پیش کرتا ہے۔ ماسٹرز پروگرام کے علاوہ شعبہ ابھرتے ہوئی اسکالرز کے لیے تحقیقی پروگرام بھی پیش کرتا ہے۔ اس وقت ڈیپارٹمنٹ میں چار مستقل اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اگلے تعلیمی سال سے، ڈپارٹمنٹ اپنا سالانہ تحقیقی جریدہ، Revelation شروع کرنے جا رہا ہے۔[۳۷]

عالیہ یونیورسٹی کلکتہ

عالیہ یونیورسٹی کلکتہ کا پرانا نام مدرسہ عالیہ ہے، اس مدرسہ کی بنیاد ۱۷۸۰ء میں رکھی گئی تھی۔[۳۸] اور ۲۰۰۸ء میں اس کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا۔ اس یونیورسٹی میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کا

قیام ۲۰۱۷ء میں عمل میں آیا، یہ شعبہ ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں میں بہت ہی نیا شعبہ ہے۔ شعبہ میں اس وقت تین سالہ بی اے (آنرس) اور دو سالہ ایم اے اسلامک اسٹڈیز کے کورسس کی تدریس کی جاتی ہے۔ شعبہ میں دو اسسٹنٹ پروفیسر اور ایک گیسٹ فیکلٹی تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔[۳۹]

بی ایس عبدالرحمٰن کریسنٹ انسٹیٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی

بی۔ ایس۔ عبدالرحمٰن کریسنٹ انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی کا ہی دوسرا نام بی۔ ایس۔ عبدالرحمٰن یونیورسٹی ہے۔[۴۰] اس یونیورسٹی کا قیام ڈاکٹر بی۔ ایس۔ کے نام پر ۱۹۸۴ء میں عمل میں آیا۔ یہ ایک پرائیویٹ یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ ''اسکول آف عربک اینڈ اسلامک اسٹڈیز'' کے نام سے ۲۰۰۹ء میں قائم ہوا۔ یہاں ''عربک اینڈ اسلامک اسٹڈیز'' کے کورس میں یو جی، پی جی اور پی۔ ایچ۔ ڈی تینوں پروگرام فراہم کیے جاتے ہیں۔[۴۱]

مولانا مظہر الحق عربک اینڈ پرشین یونیورسٹی پٹنہ

مولانا مظہر الحق عربک اینڈ پرشین یونیورسٹی، پٹنہ، کا قیام ۱۹۹۸ء میں عمل میں آیا، لیکن اس میں داخلوں اور تعلیمی سیشن کا آغاز ۲۰۰۸ء سے ہوا۔ یہاں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ ۲۰۱۸ء میں قائم ہوا، فی الحال شعبہ میں صرف ایم اے اسلامک اسٹڈیز کا پروگرام فراہم ہے۔ اس وقت یہاں تین مستقل اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی، اونتی پورہ، جموں وکشمیر

اس یونیورسٹی کا قیام ۲۰۰۵ء میں عمل میں آیا۔[۴۲] اور ۲۰۰۶ء میں یہاں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ قائم ہوا۔ اس شعبے میں اسلامک اسٹڈیز کے دو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں: ایم۔ اے اسلامک اسٹڈیز اور پی ایچ ڈی۔ یہاں چار مستقل اور تین عارضی اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اب تک یہاں ۵ پی ایچ ڈی مکمل ہو چکی اور ۷ ایم۔ فل ایوارڈ ہو چکے ہیں۔[۴۳]

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری جموں وکشمیر

یہ یونیورسٹی ۲۰۰۵ء میں قائم ہوئی۔ یہاں شعبہ عربی کا قیام اسی وقت عمل میں آیا جب یونیورسٹی معرض وجود میں آئی۔ یونیورسٹی میں اسکول آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ لنگویجز کے تحت ایک شعبہ ''ڈپارٹمنٹ آف عربک'' کے نام سے ہے۔ اسی ایک ڈپارٹمنٹ کے تحت تین موضوعات کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں: ایک تو خود عربی کا پروگرام، دوسرا اسلامک اسٹڈیز کا پروگرام، اور تیسرا اردو کا پروگرام۔ اسلامک اسٹڈیز کے پروگرام کا آغاز ۲۰۱۷ء میں ہوا۔ اس میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔[۴۴]

یونیورسٹی آف ممبئی

یونیورسٹی آف ممبئی ہندوستان کی قدیم یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔ یہاں جون ۱۹۹۳ء سے ہی عربی زبان ولٹریچر کا شعبہ قائم ہے۔ اس شعبہ کے تحت عربی تدریس کے پروگراموں کے علاوہ اسلامک اسٹڈیز کے بھی دو پروگرام پیش کئے جاتے ہیں، ایک ایم اے۔[۴۵] اور دوسرا پی ایچ ڈی۔[۴۶]

محمد علی جوہر یونیورسٹی رام پور، یوپی

محمد علی جوہر یونیورسٹی (رام پور) کا قیام ۲۰۰۶ء میں عمل میں آیا۔[۴۷] اس یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ رسمی طور پر تو قائم ہو چکا ہے، لیکن ابھی تک اس میں تعلیم کا آغاز نہیں ہوا ہے۔ اس لیے ابھی اس شعبہ کے تعلق سے کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ یونیورسٹی کے ویب سائٹ پر فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز کا عنوان نظر آتا ہے لیکن اس فیکلٹی پر کلک کرنے کے بعد کچھ بھی نظر نہیں کرتا، یونیورسٹی کے ایڈمن سیل میں رابطہ کرنے سے معلوم ہوا کہ اسلامک اسٹڈیز کی فیکلٹی بالکل تیار ہے، تاہم کچھ وجوہات کی بنا پر ابھی اس میں داخلوں کا آغاز نہیں ہو سکا ہے، جلد ہی داخلوں کا سلسلہ شروع ہوگا۔[۴۸]

ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز ایک نظر میں:

نمبر	یونیورسٹی کا نام	یونیورسٹی کا قیام	شعبہ کا قیام
	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (اتر پردیش)	۱۹۲۰ء	۱۹۵۴ء
۲	جامعہ ہمدرد (نئی دہلی)	۱۹۸۹ء	۱۹۶۳ء
۳	جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد (تلنگانہ)	۱۹۱۷ء	۱۹۶۵ء
۴	جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)	۱۹۲۰ء	۱۹۸۸ء
۵	کشمیر یونیورسٹی، سری نگر (کشمیر)	۱۹۴۸ء	۱۹۸۸ء
۶	یونیورسٹی آف مدراس	۱۸۵۷ء	۲۰۰۲ء
۷	اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی، اونتی پورہ	۲۰۰۵ء	۲۰۰۶ء
۸	بی ایس عبدالرحمٰن کریسنٹ انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی (تمل ناڈو)	۱۹۸۴ء	۲۰۰۹ء
۹	مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد (تلنگانہ)	۱۹۹۸ء	۲۰۱۳ء
۱۰	سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر	۲۰۰۹ء	۲۰۱۵ء
۱۱	عالیہ یونیورسٹی کلکتہ (ویسٹ بنگال)	۲۰۰۸ء	۲۰۱۷ء
۱۲	بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری، جموں وکشمیر	۲۰۰۵ء	۲۰۱۷ء
۱۳	مولانا مظہر الحق عربک اینڈ پرشین یونیورسٹی، پٹنہ (بہار)	۱۹۹۸ء	۲۰۱۸ء
۱۴	محمد علی جوہر یونیورسٹی، رام پور (یوپی)	۲۰۰۶ء	

ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز

مذکورہ بالا یونیورسٹیوں کے علاوہ ہندوستان میں کچھ اور یونیورسٹیاں ہیں جہاں اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم ہوتی ہے ان میں چند اہم نام حسبِ ذیل ہیں:

وشوابھارتی یونیورسٹی شانتی نکیتن (بنگال) جسے مشہور فلسفی روندر ناتھ ٹیگور نے قائم کی تھی۔ اس

یونیورسٹی میں ''ڈپارٹمنٹ آف عربک، پرشین، اردو اینڈ اسلامک اسٹڈیز'' کے نام سے ایک مشترکہ شعبہ ہے جس میں عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ اسلامک اسٹڈیز میں پی ایچ ڈی کا کورس موجود ہے، یہاں اسلامک اسٹڈیز میں بی۔اے اور ایم۔اے نہیں ہے۔[۴۹] البتہ پروفیسر مشیر الحق نے ۱۹۹۲ء کے بولیٹن میں لکھا ہے کہ یہ یونیورسٹی اپنے بی اے کے طلبہ کو ایک اختیاری سبجکٹ کے طور پر اسلامک اسٹڈیز فراہم کرتی ہے۔ ساتھ ہی اسلامی فلسفہ کو خصوصی اہمیت دیتی ہے۔[۵۰] پٹیالہ کی پنجاب یونیورسٹی نے سکھوں کے آخری گرو گرو گوبند سنگھ کے نام پر ریلیجس اسٹڈی کے لیے ۱۹۶۹ء میں ایک تدریسی اور تحقیقی شعبہ قائم کیا۔[۵۱] اس شعبہ میں ریلیجس اسٹڈی کے لیے طلبہ کو بدھ مت، سکھ مت اور عیسائیت کے ساتھ ساتھ اسلام کا بھی مطالعہ کرایا جاتا ہے، یہ شعبہ ایک سالانہ مجلّہ The Journal of Religious Studies کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اسلامک اسٹڈیز اور تقابل ادیان (Comparative Religions) کے میدان میں کچھ تحقیقی مونوگرافس بھی جاری کرتا ہے۔ ریاست پنجاب اسلامک اسٹڈیز کے میدان میں اپنی تعلیمی دلچسپی کا اظہار کرتی رہی ہے۔[۵۲] مثال کے طور پر چنڈی گڑھ کی The University of Panjab نے عظیم مسلمان صوفی بزرگ شیخ فریدالدین شکر گنج کے نام پر ایک چیئر قائم کیا۔ گرونانک دیو یونیورسٹی امرتسر نے حضرت میاں میر چیئر آف ریلیجس اسٹڈیز قائم کیا۔ یہ سب چیئرس خاص طور پر اسلامی تصوف اور ہندوستان میں اس کے عمومی اثرات اور پنجاب میں خصوصی اثرات کے مطالعہ سے وابستہ ہے۔[۵۳] مدراس یونیورسٹی میں ''جسٹس بشیر احمد سعید سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز'' کے نام سے ایک ادارہ ساؤتھ انڈین ایجوکیشنل ٹرسٹ کی گرانٹ سے مرحوم جسٹس بشیر احمد سعید کی پہل پر قائم کیا گیا تھا، جو ایک عظیم انسان تھے، جنہوں نے افہام وتفہیم کے ذریعے باہمی ہم آہنگی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ سنٹر تملناڈو میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے جو ۲۰۰۲ء میں معرض وجود میں آیا۔[۵۴] یہاں صرف ایک استاذ ہیں جو اسسٹنٹ پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔[۵۵] یہاں اسلامک اسٹڈیز کا صرف ایک پروگرام ایم اے اسلامک اسٹڈیز زیر تدریس ہے۔[۵۶]

کیرالہ یونیورسٹی

کیرالہ یونیورسٹی میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کا باقاعدہ قیام ۱۹۸۵ء میں عمل میں آیا۔ یہاں یہ

شعبہ ''ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز'' کے نام سے قائم ہے۔ اسلامی تاریخ اور کیرالہ کی تاریخ کے میدان میں قابل ذکر نامور شخصیات جیسے پروفیسر اے پی ابراہیم کنجو، ڈاکٹر سی کے کریم اور پروفیسر کے ٹی محمد علی شعبہ سے وابستہ رہے ہیں۔ اس شعبہ کے تربیت یافتہ طلباء ملک کے تعلیمی اداروں، سرکاری عہدوں، سیاسی عہدوں اور عوامی زندگی کے دیگر شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ یہ شعبہ کیرالہ یونیورسٹی کے قدیم ترین شعبوں میں سے ایک ہے۔ اس کے آغاز کا پتہ اس مسلم چندہ سے لگایا جا سکتا ہے، جسے تراونکور مسلم ایسوسیایشن، تریویندرم، اور تراونکور حکومت نے مشترکہ طور پر تراوانکور یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کی چیئر قائم کرنے کے لیے ایک لاکھ روپے جمع کیا تھا۔ جون 1946 میں یونیورسٹی کالج، تریویندرم میں اسلامی تاریخ اور ثقافت کے ایک ریڈر کا تقرر کیا گیا اور اس مضمون کو بی اے کورس کے حصہ III کے تحت ایک نئے گروپ کے طور پر شامل کیا گیا۔ اس دوران اس پوسٹ کو یونیورسٹی کالج، تروانت پورم سے فاروق کالج، کالی کٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں مشہور مورخ ڈاکٹر اے پی ابراہیم کنجو کو کالج میں اسلامی تاریخ کے لیکچرر کے طور پر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۶۸ء میں کیرالہ یونیورسٹی میں تاریخ کے شعبہ کے قیام کے ساتھ ہی اسلامی تاریخ میں ریڈر کی ایک پوسٹ بھی تخلیق کی گئی۔ ڈاکٹر اے پی ابراہیم کنجو نے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۴ء تک ریڈر کے طور پر کام کیا۔ یہ شعبہ ۱۹۸۵ء میں شعبہ تاریخ سے الگ کر دیا گیا اور ڈاکٹر سی کے کریم، سابق ریاستی ایڈیٹر، کیرالہ گزیٹیئرز کو نئے شعبہ اسلامیات کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ ۱۹۸۷ء تک بہت سے محققین نے ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی پروگرام کے لیے رجسٹریشن کرایا۔ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے باقاعدہ کورسز ۱۹۹۰ء میں شروع کیے گئے تھے۔ اس وقت شعبہ میں صرف دو مستقل اساتذہ ہیں[۵۷] اور یہاں صرف دو پروگرامس زیرِ عمل ہیں ایک ایم اے اسلامک اسٹڈیز اور دوسرا ایم اے ویسٹ ایشین اسٹڈیز۔[۵۸]

کنور یونیورسٹی (Kannur University) کیرالہ میں بی اے عربک اینڈ اسلامک ہسٹری اور بی اے اردو اینڈ اسلامک ہسٹری کے نام سے دو کورسس موجود ہیں جن میں اسلامک ہسٹری کے تحت اسلامک اسٹڈیز کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔[۵۹] کیرالہ کی کالی کٹ یونیورسٹی سے ملحق بہت سے کالجز میں اسلامک اسٹڈیز کے انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کے کورسس موجود ہیں۔ لیکن خود کالی کٹ یونیورسٹی کے ڈپارٹمنٹس میں اسلامک اسٹڈیز کا کوئی کورس نہیں پایا جاتا ہے۔ بہرحال

اس سے ملحق کالجوں میں انڈر گریجویٹ پروگراموں میں بی اے اسلامک اسٹڈیز، بی اے اسلامک ہسٹری، بی اے عربک اینڈ اسلامک ہسٹری، بی اے اسلامک فینانس وتھ (وِد) اپلیکیشن اور بی اے اکنامک وتھ (وِد) اسلامک فینانس جیسے کورسس موجود ہیں۔[۶۰] ماسٹرز کے پروگراموں میں ایم اے اسلامک اسٹڈیز، ایم اے اسلامک ہسٹری، ایم اے اسلامک فینانس اور ایم اے اسلامک اکنامکس جیسے کورسس دستیاب ہیں۔[۶۱] مہاتما گاندھی یونیورسٹی میں بی اے اسلامک ہسٹری کا کورس فراہم ہے۔[۶۲] اور ایم اے اسلامک ہسٹری بھی دستیاب ہے۔[۶۳]

کشمیر

کشمیر کی چار یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے قائم ہیں، وہ چار یونیورسٹیز کشمیر یونیورسٹی، سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی اور بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی ہیں۔ ان چاروں کا تعارف ماقبل میں آچکا ہے۔ ان میں سے کشمیر یونیورسٹی کے شاہ ہمدان انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز وادی میں اسلامک اسٹڈیز کا سب سے قدیم شعبہ ہے جس کا قیام ۱۹۸۹ء میں عمل میں آیا تھا۔

ان یونیورسٹیوں کے شعبوں کے علاوہ وادی کے بیشتر کالجز میں یو جی سطح پر اسلامک اسٹڈیز پڑھایا جاتا ہے۔ اور ان کالجوں کا نصاب کشمیر یونیورسٹی تیار کرتی ہے، کیوں کہ وادی کے کالجز کشمیر یونیورسٹی سے ملحق ہیں۔ جموں وکشمیر کے زیادہ تر کالج، خاص طور پر وادی میں، سوشل سائنس اسٹریم میں ایک اہم مضمون کے طور پر اسلامک اسٹڈیز پڑھاتے ہیں، ان کالجز میں امر سنگھ کالج، گورنمنٹ ڈگری کالج سوپور، اور گورنمنٹ ڈگری کالج بوائز انت ناگ ان قدیم ترین کالجوں میں سے ہیں جہاں سب سے پہلے اسلامک اسٹڈیز کو متعارف کرایا گیا تھا۔ اسے دیگر کالجوں میں وقتاً فوقتاً متعارف کرایا جاتا رہا ہے، جن میں ٹنگدھر (Tangdhar)، کپواڑہ، سوپور، سری نگر، پلوامہ، شوپیاں (Shopian)، انت ناگ، کوکرناگ (Kokernag) وغیرہ کے کالج شامل ہیں۔[۶۴]

حواشی وحوالہ جات

1- Siddiqui, Islam at Universities in England, 28.

2- http://www.oxfordislamicstudies.com/print/opr/t236/e0395 Accessed June 2, 2022.

۳۔ محمد زبیر، اسلام اور مستشرقین (لاہور، رحمۃ للعالمین، ۲۰۱۴ء) ص: ۷

4. Mumtaz Ahmad, "Islamic Stududies in American Universities: Conversation, Discourses, Dialogues"The State of Islamic Studies in American Universities (Herndon: The International Institute of Islamic Thought, 2009)

5. Albert Hourani, Islam in European Thought (Cambridge: CUP, 1991).

۶۔ مقبول احمد، اسلامک اسٹڈیز کی تاریخ اور اس کے تحقیقی مسائل، ص: ۱۶

۷۔ ایضاً، ص: ۶

۸۔ وارث متین مظہری، ہندوستانی جامعات میں اسلامک اسٹڈیز: توقعات اور چیلنجز، ص: ۱۲۱

۹۔ عنایت اللہ، اسلامک اسٹڈیز کا مقصد اور اس کی تاریخ، ص: ۴۱۱

10. Abdul Majid Khan, "Scope of Islamic Studies in the modern times

11. Mohamed Taher, Islamic Studies in India

۱۲۔ محمد عرفان احمد، ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز-ایک جائزہ، ص: ۱۹-۱۸

۱۳۔ علی اشرف، بہار کے مسلم خواص، مترجم تقی رحیم (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۶ء) ص: ۳۷-۲۷

14. MushirulHaq, Islamic Studies in Modern India.

۱۵۔ اقتدار محمد خاں، ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز: معنویت اور مستقبل، مشمولہ اسلامک اسٹڈیز، تصور، صورتِ حال اور مستقبل (حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ۲۰۲۲ء) ص: ۸۴

16. N. Akmal Ayyubi, "Presidential Address" Bulletin of Institute of Islamic Studies No. 22. (AMU: 1989)

۱۷۔ ڈاکٹر محمد عرفان احمد، ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز: ایک جائزہ، مشمولہ اسلامک اسٹڈیز، تصور، صورتِ حال اور مستقبل (حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ۲۰۲۲ء) ص: ۱۹

18. Ayyubi, "Presidential Address" Bulletin of Institute of Islamic Studies,

19. "About the Department," Department of Islamic Studies, Aligarh Muslim University, accessed August 13, 2022,

https://www.amu.ac.in/department/islamic-studies.

۲۰۔ عبدالغفار مدہولی، جامعہ کی کہانی (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۴ء) ص: ۲۸-۲۷

21. "Welcome to Department of Islamic Studies," Jamia Hamdard, accessed June 26, 2022, http://jamiahamdard.edu/Department/Deptindex.aspx?page=a&ItemID=mm&nDeptID=kq.

۲۲۔ ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، عثمانیہ یونیورسٹی پروفائل (۲۰۰۶-۲۰۰۵ء) ص: ۲

۲۳۔ ایضاً

24. "Dr. B.R. Ambedkar Memorial Library," Osmania University, accessed June 13, 2022, http://14.139.82.46:8080/newgenlibctxt/Search?searchText=Islamic+Studies&Index=Anywhere&SelectedUnixNames=&From=Library&ResultSetOffset=1&LibraryId=1&FormName=All&ApplyFacet=false&AuthorSearch=&SubjectSearch=&ClassNumberSearch=&NewSearch=true&ExactAFId=&SortField=.

25. "Head of Department's Message," Shah-I- Hamdan Institute of Islamic Studies, accessed October 4, 2022, http://islamicstudies.uok.edu.in/Main/Message.aspx?Type=Head Message.

26. "Welcome to University of Madras," University of Madras, accessed November 1, 2022, https://www.unom.ac.in/

27. "JBAS Centre for Islamic Studies," University of Madras, accessed August 8, 2022, https://www.unom.ac.in/index.php?route=department/department/deptpage&deptid=40

28. "JBAS Centre for Islamic Studies."

29. "JBAS Centre for Islamic Studies."

30. Maulana Azad National Urdu university Profile (2017), 9.

31. "Introduction to Department of Islamic Studies," Maulana Azad National Urdu University, accessed February 23, 2022,

https://manuu.edu.in/ur/University/SASS/Islamic-Studies/Profile

32. Maulana Azad National Urdu university Profile (2017), 9.

33. "Profile, Satellite Campus Budgam," Maulana Azad National Urdu University, accessed September 20,2022, https://manuu.edu.in/University/Satellite-Campuses/Satellite-Campus-Budgam/Profile

34. "Courses Offered, Satellite Campus Budgam," accessed September 20,2022, https://manuu.edu.in/University/Satellite-Campuses/Satellite-Campus-Budgam/Courses-Offered.

35. "Profile, Satellite Campus Lucknow," Maulana Azad National Urdu University, accessed August 8, 2022, https://manuu.edu.in/University/Satellite-Campuses/Satellite-Campus-Lucknow/Profile.

36. Central University of Kashmir, accessed August 8, 2022, https://www.cukashmir.ac.in/About-us/Cu-Kashmir.aspx.

37. "About the Department," Central University of Kashmir, accessed August 8, 2022, https://www.cukashmir.ac.in/displaydepartment.aspx?sid=89&did=18&pag=638

۳۸۔ مولانا محبوب الرحمٰن، انگریزی عہد کا ایک دینی مدرسہ، مدرسہ عالیہ کلکتہ ۱۷۸۱ سے ۱۹۵۴ء تک مشمولہ ماہنامہ البلاغ تعلیمی نمبر، جلد:۱، شمارہ ۷، ۸، ۹ (دسمبر ۱۹۵۴ء، جنوری، فروری ۱۹۵۵ء) ص:۴۱۰

39. "Department of Islamic Studies," AliahUniversity, accessed 18 May 2022, https://aliah.ac.in/department/cms-page.php?key=islamic-studies&page_key=the-department.

40. "About us," B.S. Abdur Rahman Crescent Institute of Science & Technology, accessed June 26, 2022, https://crescent.education/university/about-us/.

41. "School of Arabic and Islamic Studies," B.S. Abdur Rahman Crescent Institute of Science & Technology, accessed June 26, 2022, https://crescent.education/university/schools/school-of-arabic-islamic-studies/overview/.
42. "About us," Islamic University of Science & Technology, accessed August 13, 2022, https://www.iust.ac.in/about-us.aspx.
43. This information is based on phonetic contact with Dr. Afroz Ahmad Bisati the Head of the Department of Islamic Studies Dated on June 28, 2022.
44. "Department of Arabic," BABA GHULAM SHAH BADSHAH UNIVERSITY, accessed June27, 2022, https://www.bgsbu.ac.in/deparabic/arbidep.aspx.
45. "Arabic Department," University of Mumbai, Accessed September 20,2022, https://old.mu.ac.in/wp-content/uploads/2016/06/4.3-M.A.-in-ISLAMIC-STUDIES.pdf.
46. "Arabic Department," University of Mumbai, accessed September 20,2022, https://mu.ac.in/department-of-arabic.
47. Jauhar University, accessed 26 June 2022, http://jauharuniversity.edu.in/about_us.html.
48. This information is based on phonetic contact with Addmissin cell on the Number: 759936708 Dated on May 19, 2022.
49. "Syllabus," Visva Bharati - IQAC, accessed October 5, 2022, https://visvabharati.ac.in/iqac/Syllabus.html.
50. MushirulHaq, Islamic Studies in Modern India, 4.
51. "About The Department," Punjabi University, Patiala, accessed October 5, 2022, http://www.punjabiuniversity.ac.in/Pages/Department.aspx?dsenc=74 .
52. MushirulHaq, Islamic Studies in Modern India, 4.

53. MushirulHaq, Islamic Studies in Modern India, 4-5.
54. "About the Department, JBAS Centre for Islamic Studies," University of Madras, accessed August 8, 2022, https://www.unom.ac.in/index.php?route=department/department/deptpage&deptid=40
55. "About the Department, JBAS Centre for Islamic Studies."
56. "About the Department, JBAS Centre for Islamic Studies."
57. "University Departments,"University of Kerala, accessed October 10, 2022, https://www.keralauniversity.ac.in/dept/dept-home.
58. "University Departments," University of Kerala.
59. "Courses Offered," Kannur University, accessed October 10, 2022, https://www.kannuruniversity.ac.in/en/academics/courses-offered/.
60. "Undergraduate Courses," Calicut University, accessed October 10, 2022, https://www.uoc.ac.in/index.php/2016-04-27-10-19-11/2016-04-29-10-02-43
61. "Undergraduate Courses," Calicut University.
62. "Academic Programs," Mahatma Gandhi University, Kerala, accessed October 10, 2022, https://www.mgu.ac.in/programmes/?current-page=6&filter=&category=0
63. "Academic Programs," Mahatma Gandhi University, Kerala.
64. Tauseef Ahmad Parray, "'ISLAMIC STUDIES': Misconceptions and Misunderstandings" Published in Greater Kashmir on 14th August 2017.

تعارف وتبصرہ

نام کتاب	:	حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی: احوال وارشادات مجالس
تصنیف	:	ڈاکٹر انیسہ خاتون
باہتمام	:	عذرا بک ٹریڈرس، دہلی
طبع اولیٰ	:	۲۰۲۳ء
صفحات	:	۱۶۰
قیمت	:	۲۵۰ روپے
تعارف وتبصرہ:		محمد سعید انور

تصوف کا اصل مادہ 'صوف' ہے جس کا معنی ہے 'اون' اور تصوف کا لغوی معنی ہے 'اون کا لباس پہننا' جیسے 'تقمص' کا معنی ہے قمیص پہننا۔ صوفیا کی اصطلاح میں تصوف کے معنی ہیں اپنے اندر تزکیہ وتصفیہ کرنا، یعنی اپنے نفس کو نفسانی کدورتوں اور رذیلہ اخلاق سے پاک وصاف کرنا اور فضائلِ اخلاق سے مزین کرنا۔ صوفیاء ان

لوگوں کو کہتے ہیں جو اپنے ظاہر سے زیادہ اپنے باطن کے تزکیہ وتصفیہ پر توجہ دیتے ہیں اور دوسروں کو اسی کی دعوت دیتے ہیں۔ اب لفظ 'صوفی' اپنے لغوی معنی (اونی لباس پہننے والا) میں استعمال نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اپنے اندرون تزکیہ وتطہیر کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ اس طرح یہ لفظ اب انھیں لوگوں کے لیے لقب کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے۔

مشہور حدیث جبریل میں جس 'احسان' کا ذکر ہے، کسی بندہ کے دل میں احسان کی اسی کیفیت کو پیدا کرنے کا نام صوفیا نے تصوف وسلوک رکھا ہے۔ تصوف مذہب اسلام سے جدا کوئی چیز نہیں ہے۔ تصوف کا ایک لازمی نتیجہ بندہ کے دل میں خدا کی محبت کا پیدا ہونا ہے۔ خدا کی محبت خلق خدا کی محبت کی طرف فطری طور پر لے جاتی ہے اور اس لیے بھی لے جاتی ہے کہ خلق خدا خدا کا عیال ہیں۔

تصوف کے مشہور چار سلسلے ہیں چشتی، قادری، نقشبندی، سہروردی۔ یہ سلسلے بالترتیب چار بڑے حضرات کی طرف منسوب ہیں، خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، سید عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ۔ مذکورہ چار مشہور سلسلوں میں سلسلۂ چشتیہ کے بانی حضرت ابواسحاق شامی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ سب سے پہلے لفظ 'چشتی' ان کے ہی نام کا جز بنا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی حسن سنجریؒ کی شخصیت نے اس سلسلے کے تحت دعوت حق کا جو کام انجام دیا اور آپ کو جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی اس سے لفظ 'چشتی' دنیا بھر میں مشہور ومقبول ہوا۔ طریقت کے دیگر سلسلوں کی طرح یہ سلسلہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔

برصغیر میں سلسلہ چشتیہ کے بانی خواجہ شیخ معین الدین حسن سنجری ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی پرتھوی راج کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے اور اجمیر کو اپنا مستقر بنا کر سلسلے کا کام شروع کر دیا۔ سلسلے کے مشہور مشائخ کے اسماء گرامی

حسبِ ذیل ہیں: حضرت علیؓ، حضرت حسن بصریؒ، خواجہ عبدالواحد بن زیدؒ، خواجہ ابراہیم ادہمؒ، خواجہ حذیفہ المرعشی، خواجہ امین الدین بصریؒ، خواجہ ممشاد علی دینوری، خواجہ ابواسحاق شامی چشتی، خواجہ ابو احمد چشتی، خواجہ ابومحمد ابن احمد چشتی، خواجہ ابو یوسف چشتی، خواجہ مودود چشتی، خواجہ حاجی شریف زندانی چشتی، خواجہ عثمان ہرونی چشتی اور خواجہ معین الدین چشتی۔

اس بات سے انکار نہیں کہ خواجہ معین الدین چشتی سے قبل کچھ اور چشتی بزرگ بھی ہندوستان تشریف لا چکے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چشتیہ سلسلے کو ہندوستان میں جاری کرنے کا شرف خواجہ معین الدینؒ کو ہی حاصل ہوا۔ میر خورد نے ان کو نائب رسول فی الہند لکھا ہے۔ عہد معین الدین چشتی جو پرتھوی راج کا عہد ہے اس میں برادرانِ وطن میں ذات پات پر مبنی نابرابریاں عروج پر تھیں اور چھوت چھات کا ایک بھیانک ماحول تھا۔ حضرت چشتی نے اس ماحول میں نظریہ توحید عملی حیثیت سے پیش کیا اور بتایا کہ یہ صرف تخیلی چیز نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک ایسا اصول ہے جس کو تسلیم کر لینے کے بعد ذات پات کی ساری تفریق بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہ ایک زبردست دینی اور سماجی انقلاب کا اعلان تھا۔

حضرت خواجہ صاحبؒ نے اپنے ایک عزیز مرید اور خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو دہلی میں رہ کر سلسلہ کی نشر و اشاعت پر متعین کیا تھا۔ خواجہ قطب صاحب نے شمالی ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کو پھیلانے کی کوشش کی اور ساری عمر اپنے پیر و مرشد کے اصولوں پر سختی سے عامل رہے۔ قطب الدین صاحبؒ کا دہلی میں قیام کر لینا چشتیہ سلسلے کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ دہلی اس وقت اسلامی حکومت کا قلب و جگر بن چکی تھی۔ وہ تمام عناصر جو آئندہ صدی میں مسلمانوں کی دینی اور ثقافتی زندگی پر اثر انداز ہونے والے تھے، یہاں موجود تھے۔ ان میں چشتیہ سلسلہ کو کامیاب بنانے کا سامان فراہم کرنا تھا۔ قطب صاحبؒ نے دارالسلطنت کے مہلک اثرات سے نہ صرف اپنا دامن بچا لیا تھا بلکہ یہاں کے حالات سے پورا فائدہ اٹھایا

اور تصوف کے خیالات ہر طبقہ تک پہونچا دیئے۔

تذکروں میں قطب صاحبؒ کے متعدد خلفاء کا ذکر ملتا ہے لیکن سلسلے کو جن دو خلفاء سے بے حد فائدہ پہونچا وہ بابا فریدؒ اور بدرالدین غزنویؒ ہیں۔ آپ دونوں نے سلسلے کی نشر و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اول الذکر کے خلفاء میں مشہور ترین خلیفہ شیخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ہوئے ہیں۔ دراصل ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کی داغ بیل حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہاتھوں پڑی، حضرت بابا فرید گنج شکر رحمہ اللہ نے اسے منظّم کیا اور حضرت شیخ خواجہ نظام الدین اولیا رحمہ اللہ نے اسے معراجِ کمال تک پہونچا دیا۔ نصف صدی سے زیادہ ان کی خانقاہ ارشاد وتلقین کا مرکز اور رشد و ہدایت کا سرچشمہ بنی رہی۔ ملک کے گوشے گوشے سے لوگ وہاں پروانوں کی طرح جمع ہوتے تھے اور عشقِ الٰہی کی تپش اور خدمت خلق کا جذبہ لے کر واپس جاتے تھے۔

شیخ نظام الدین اولیاء کے خلفاء میں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ امتیازی شان رکھتے ہیں۔ حضرت شیخ کے وصال کے بعد چشتیہ سلسلے کے مرکزی نظام کو شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے ہی سنبھالا۔ موصوف میں اپنے پیر ومرشد کی بہت سی خوبیاں موجود تھیں۔ موصوف نے ابتدا حال میں امیر خسرو کی معرفت اپنے پیر سے درخواست کی کہ ان کو کسی تنہائی کے مقام پر رہ کر عبادت کرنے کی اجازت دی جائے۔ محبوبِ الٰہی نے جواب میں فرمایا:

"اورا بگو ترا درمیان خلق می باید وجفا وقضائے خلق می باید کشید و مکافات آں بذل وایثار وعطا می باید کرد۔"

ترجمہ: شیخ نصیر سے کہہ دو کہ تمہیں خلق خدا میں رہنا اور لوگوں کے جور وظلم کے مصائب جھیلنا چاہیے اور ان کے عوض بذل وایثار وسخاوت

وبخشش کرنی چاھیے۔

پیر ومرشد کے اس فرمان پر وہ آخر دم تک عامل رہے۔کوئی جفا وقضا ایسی نہ تھی جس سے انھیں دوچار نہ ہونا پڑا ہو۔لیکن ان کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہ آیااوران کے پایۂ ثبات میں کبھی لغزش پیدا نہ ہوئی۔

حضرت چراغ دہلوی کواپنے سلسلے کا کام انتہائی نامساعد حالات میں کرنا پڑااس لیے کہ تب دہلی علاءالدین خلجی کی دہلی نہ رہ گئی تھی کہ بقول ان کے کہ خوش حالی اور فارغ البالی کا یہ عالم تھا کہ ہرفقیر کے پاس ایک چھوڑ دو دولحاف ہوتے تھے۔تب یہ بدقسمت شہر مطلق العنان بادشاہ محمد بن تغلق کے بدلتے ہوئے افکار وتصورات کا بازیچہ بنا ہوا تھا۔ایسے بحرانی دور میں ایک کل ہندروحانی نظام کو چلانے کے لیے بڑی فکراور عملی صلاحیتیں درکارتھیں۔حضرت چراغ دہلوی ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہےاور ہمت واستقلال کے ساتھ کام کرتے رہے۔

ڈاکٹر انیسہ خاتون صاحبہ نے موصوف کے احوال وارشادات مجالس سے متعلق ایک بیش قیمت تصنیف پیش کرنے کی شاندارکوشش کی ہے۔موصوف نے خیرالمجاس سے فارسی اقتباسات لیے ہیں جن سے کتاب بلاشبہ مزین ہوجاتی ہے تاہم اگران اقتباسات کے اردوترجمے کردیئے جاتے تو بہتر ہوتا۔امید ہے آئندہ ایڈیشن میں اس بات کا خیال رکھا جائے گا۔خیرالمجالس سومجلسوں پر محیط ہےاوران سبھی کا ذکر ان کی تصنیف میں ہےاورسبھی مجلسوں سے متعلق اہم باتیں ذکر کی گئی ہیں۔

پیر ومرشد کے تعلقات، تربیت کے نت نئے پہلو اور ارشاد وسلوک کے مدارج طے کرنے کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ شیخ نصیر الدین چراغ کی مریدیت کے جامع منظرنامے کی پیش کش کی گئی ہے۔مجلس دوازدہم کے حوالے سے حضرت شیخ ودرویش کی حالت وکیفیت وماہیت بیان فرمائی گئی ہے۔جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ شیخ نصیر نے سلطان محمد بن تغلق کا زمانہ پایا تھا،موصوف مصنفہ نے شیخ کے سلطان سے تعلقات پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے حوالے سے بہتر انداز میں روشنی

ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

تصوف میں مسئلہ سماع علماء اسلام کے درمیان کافی بحث ومباحثہ کا موضوع رہا ہے۔ چشتیہ سلسلے میں محفل سماع وقوالی کا عام رواج رہا ہے۔اس کی ابتدا ابواسحاق شامی سے ہی ہوچکی تھی۔محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کے نزدیک سماع سے متعلق کچھ شرائط رہی ہیں، کتاب ہذا میں ان شرائط سے بھی بحث کی گئی ہے۔محبوب الٰہی کے وضع کردہ شرائط کی روشنی میں مولانا حمید قلندر کے حوالے سے مصنفہ رقم طراز ہیں: ''حضرت شیخ نصیرالدین سماع کو شریعت اور سنت کے عین مخالف سمجھتے تھے۔''

کتاب کے آخری حصے میں خیر المجاس میں ذکر کردہ انبیاء خلفاء راشدین، اولیاء عظام اور بزرگانِ دین کا مختصر تذکرہ ہے۔ سلسلۂ چشتیہ کی آخری شاہکار کڑی حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ پر ایک مختصر مگر جامع تذکرہ پیش کرکے مصنفہ نے چشتی سلسلہ کے اولیاء کو بالخصوص اور تصوف کے شہ سواروں کو بالعموم ایک بہترین خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنفہ کی کوششوں کو شرف قبولیت بخشے۔آمین

(سہ ماہی)

اسلام اور عصرِ جدید

کے خاص شمارے

سیرت ومغازی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین............۲۰۰روپے

اسلامی تهذیب وتمدن (دورِ جاہلیت سے آغاز اسلام تک)............۳۰۰روپے

نذرِ علی محمد خسرو..۱۰۰روپے

بیاد خواجه غلام السیّدین.......................................۱۰۰روپے

بیاد پروفیسر مشیر الحق...۲۰۰روپے

افکارِ ذاکر..۱۵۰روپے

مولانا عبیدالله سندھی...۲۰۰روپے

ڈاکٹر سید عابد حسین اور نئی روشنی.........................۲۵۰روپے

مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت....................................۱۵۰روپے

نذرِ رومی...۲۰۰روپے

قرآن مجید، مستشرقین اور انگریزی تراجم.................۱۰۰روپے

پیکر دین ودانش: امام غزالیؒ....................................۳۰۰روپے

معلمِ عصر: سعید نورسیؒ ۲۰۰روپے

ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی ۱۰۰/روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۲۵ فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطـــه

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

رسالہ جامعہ

کے خاص شمارے

جشن زریں نمبر.................................. ۱۰۰روپے
ڈاکٹر مختار احمد انصاری.............................. ۱۰۰روپے
سالنامہ ۱۹۶۱ء.. ۱۰۰روپے
اسلم جیراجپوری نمبر.................................. ۱۰۰روپے
پروفیسر محمد مجیب نمبر.................................. ۱۰۰روپے
مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں.............................. ۱۵۰روپے
پریم چند کی یاد میں.................................. ۱۰۰روپے
نہرو نمبر.. ۱۰۰روپے
جامعہ پلاٹینم جوبلی نمبر.................................. ۱۰۰روپے
ابوالکلام آزاد نمبر (پہلی اور دوسری جلد).................. ۳۰۰روپے
خواجہ حسن نظامی اور اُردو نثر.............................. ۱۰۰روپے
خلیل الرحمن اعظمی کی یاد میں.............................. ۱۰۰روپے
بلونت سنگھ کی یاد میں.................................. ۱۰۰روپے
ابوالفضل صدیقی کی یاد میں.............................. ۱۵۰روپے
نذرِ انیس.. ۳۰۰روپے
گاندھی اورگاندھیائی فکر.................................. ۳۰۰روپے
محمد علی اور پروانۂ آزادی.................................. ۳۰۰روپے

ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی (۱۹۶۱ء تا حال) فی ۱۰۰/ روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۲۵ فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

Vol. LV I No. 4 I R.N.I. No. 17614/69 I October 2023

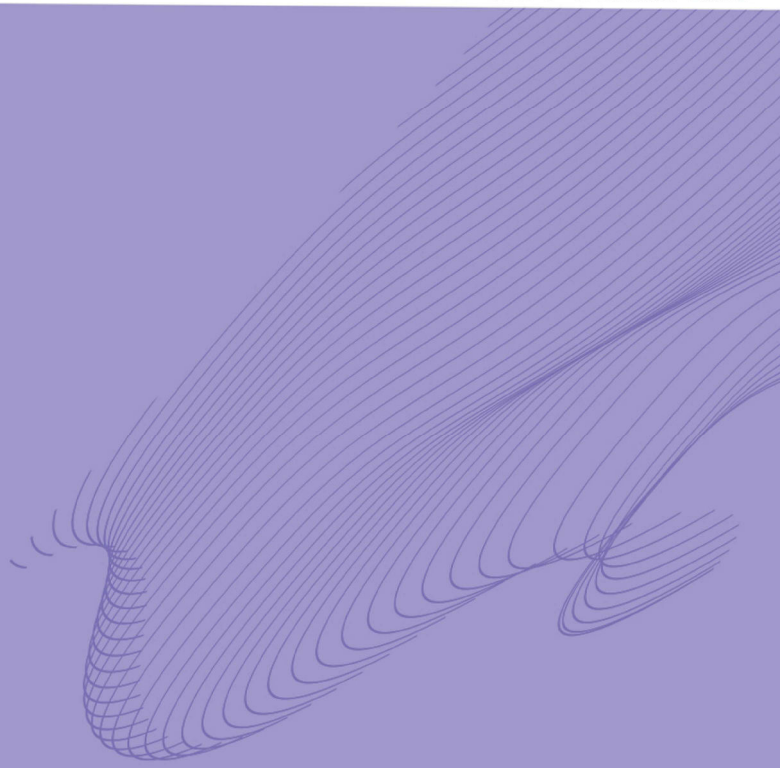

ISLAM AUR ASR-I-JADEED

ISSN 2278-2109

Zakir Husain Institute of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Phone: 011-26841202